انجیر کے پھول
بلوچستان کے افسانے
انتخاب و ترجمہ:
افضل مراد

انجیر کے پھول

بلوچستان کے افسانے

انتخاب و ترجمہ:

افضل مراد

ترتیب

انجیر کے پھول .... محمد حمید شاہد ۵
اس مجموعے کے افسانہ نگار ۱۱

بلوچی افسانے

.....اور بلوچ نے مجھے دھکا دیا .... گوہر ملک ۱۶
دادی کیوں تنہا ہے .... گوہر ملک ۲۲
کیا یہی زندگی ہے؟ .... ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی ۳۱
تھوڑا سا پانی .... غنی پرواز ۳۷
دس دس کے صرف چار نوٹ .... غنی پرواز ۴۱
قتل رحم دلی .... صورت خان مری ۵۰
کہاں سے آئے ہو؟ .... پروفیسر صبا دشتیاری ۵۴
اور پھر گیٹ کھلا .... منیر بادینی ۵۷
تاریک راہیں .... ڈاکٹر علی دوست بلوچ ۶۳

بے گناہی کا گناہ........................ حکیم بلوچ........................ ۷۰
بانی اب بھی بے بس .... پروفیسر عزیز بگٹی........................ ۷۹

پشتو افسانے

۲۰۳۵........................ دُر محمد کاسی ۸۷
آب حیات........................ نصیب اللہ سیماب........................ ۹۴
پرندہ .... فاروق سرور ۹۸

براہوی افسانے

انجیر کا پھول........................ ڈاکٹر تاج رئیسانی ۱۱۰
چیخ........................ ظفر مرزا........................ ۱۱۵
ادھورے خواب........................ وحید زہیر ۱۱۸
آخری نظر........................ وحید زہیر ۱۲۳
گرو........................ وحید زہیر ۱۲۷
بارش کی دعا........................ عارف ضیاء........................ ۱۳۲
چرواہے کے لوک گیتوں کی محبوبہ .... عارف ضیاء........................ ۱۳۶
ڈاکٹر........................ اثیر عبدالقادر شاہوانی ۱۴۱
گم شدہ خطوط........................ افضل مراد ۱۴۴
آخری فیصلہ........................ افضل مراد ۱۵۰
دوسرا سچ........................ افضل مراد........................ ۱۵۵

●

مزاحمت کی درسیات........................ آصف فرخی ۱۶۱

محمد حمید شاہد

انجیر کے پھول

کہتے ہیں، بابلی سلطنت کا پہلا بادشاہ بہرود نسبی لحاظ سے بلوص تھا۔ شام اور حلب کے وہ لوگ جو اوپر جا کر اسی سلسلہ نسب سے جڑ جاتے ہیں، بلوصی کہلائے۔ یہ لوگ رومیوں کی دراز دستیوں سے تنگ آ کر ایک وسیع اجاڑ اور خشک وادی میں پناہ گزیں ہوئے جو وادی بلوص کہلائی۔ یہی وادی آج کا بلوچستان ہے اور اس میں بسنے والے بلوچ گزرے وقتوں کے بلوص ہیں۔

تاریخ اپنے بھید اتنی سہولت سے نہیں کھولتی جتنا ہم گمان کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم فوراً کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتے، پہنچ بھی جائیں تو بہت جلد پچھتانا پڑتا ہے کہ نئے نئے آثار ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ نئی حقیقتیں اپنے اسرار عیاں کر کے ہمیں پہلے فیصلوں سے منحرف کر دیتی ہیں۔ انہی آثار کے وسیلے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلوص بعد میں بلوش اور بعلوث کے ناموں سے پکارے گئے۔ ظاہر ہے ہر نام کی اپنی تاریخ اور تاریخ کے پہلو سے پھوٹتی اپنی دیو مالا ہوتی ہے۔ لہذا ان ناموں کے ساتھ وابستہ کہانیوں کے بھی اپنے اپنے بھید ہیں۔ تاہم یہ سارے آثار اور حوالے اس بات کی تصدیق

کرتے ہیں کہ کل کے بلوص اور بلوش اور بعلوث ہی آج کے بلوچ ہیں۔ اور جہاں وہ آج کل بس رہے ہیں، یہ وادی کبھی بلوص ہوگی مگر اب بلوچستان ہوگئی ہے۔ شمال میں کوہ سلیمان کے مختلف سلسلے، مشرق میں کیرتھر اور پب کی پہاڑیاں، مغرب میں ایرانیوں کی قدیم تہذیب اور جنوب میں چار سو ستر میل تک سرحدوں کو چوم چوم کر پلٹنے والے بحیرہ عرب کے وسیع پانیوں کا سلسلہ۔ اور اس کے بیچ وہ علاقہ پڑتا ہے۔ جسے دیکھنے نکلو تو حیرتیں سینوں پر چڑھ دوڑتی ہیں اور جاننے اور بوجھنے کو ذرا کریدو تو کلیجہ مُنھ کو آتا ہے۔ ایک لاکھ سینتیس ہزار مربع میل کے اس علاقے میں پھیلے لگ بھگ چوبیس پچیس لاکھ انسانوں کے دکھ سکھ میں کہانی کے وجود کو بھی ایک نئے لطف سے سرشار کیا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلوچستان کے بلوچی ہوں کہ براہوی، دونوں سامی الاصل ہیں۔ کوئی بلوچوں کو ترکمانی قرار دے دیتا ہے اور کچھ کے نزدیک یہ ایرانی ہیں۔ انہیں راجپوت یا پھر آریا ثابت کرنے والے کے بھی اپنے اپنے دلائل ہیں تاہم بلوچ خود کو امیر حمزہ کی اولاد بتاتے ہیں۔ اور یہ بھی بتاتے ہیں کو وہ حلب سے آئے تھے۔ عربوں کی طرح قبائلی نظام قائم کر کے رہنا اور ان کا، چاہے وہ رند ہو یا لاشاری، کورائی، بلیدی اور جتوئی، عربوں جیسی روایات کا امین ہو جانا ہمیں بلوچوں کی بات مان لینے پر مجبور کرتا ہے۔

براہویوں کا قصہ بھی بھید بھرا ہے۔ براہوی خود کو حضرت ابراہیمؑ کے نسب سے جوڑتے ہیں تاہم ان کے بارے میں اس حوالے سے مختلف روایات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ گریرسن نے ان کی درواڑی زبان سے قیاس قائم کیا تھا۔ کہ ہو نہ ہو یہ یہیں کے مستقل باشندے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق گوجر قبائل سے ہے۔ اور بعضے براہوی کے لفظی معنی پہاڑی آدمی سے انہیں مستقل بسنے والے قرار دیتے ہیں۔ لکھنے والوں نے انہیں ایرانی گوجر، کرد اور ترک مغول بھی لکھا ہے۔ تاہم یہ رئیسانی، مینگل، بزنجو اور نگی ہوں یا نوشیروانی، شاہوانی، رند، مری یا پھر گمسی، دیناری اور زہری ان کے ہاں بھی قبائلی نظام بڑا مستحکم ہے۔ اور اس نظام کی بھی اپنی مستحکم روایات ہے۔

اس سارے منظر نامے کو ذہن میں تازہ کرنے کے بعد اب ہم نہایت اعتماد کے ساتھ ان کہانیوں کے بہت قریب رہ کر کچھ وقت گزار سکتے ہیں، یوں کہ ان کی خوشبو اور ان کا مزاج ہمارے تخلیقی وجود کا حصہ ہو جائے۔ یہ کہانیاں شہری زندگی کی پُر پیچ گلیوں، بھرے پڑے دفتروں، لہلہاتے کھیتوں اور لحہ لحہ انسانوں کو نگلتے بازاروں سے نہیں پھوٹیں بلکہ انہیں سراوان اور جھالاوان کے علاقوں نے جنم دیا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ ان میں بلوچستان کی وسعتیں سما گئی ہیں۔۔۔ وسعتیں بھی اور ان وسعتوں پر محیط دکھ کے آسمان بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ بلوچی، پشتو اور براہوی کہانیوں کو افضل مراد نے اردو میں ایک مجموعے کی صورت مہیا کر کے اردو کہانی پر ایک نئے ذائقے کا دریچہ وا کیا ہے۔ افضل مراد خود بھی امکانات سے بھرے ہوئے تخلیق کار ہیں، شعر کہتے ہیں، کہانی لکھتے ہیں اور خلوصِ نیت سے تخلیقی عمل سے جُڑے رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کہانیوں کو ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے تخلیقِ نو کا سا سماں باندھ دیا ہے۔ یہ کہانیاں پڑھتے ہوئے کہیں بھی کوئی جملہ اُچٹا ہوا نہیں لگتا۔ مترجم نے زبان سادہ اور رواں رہنے دی تاہم اس التزام کے ساتھ کہ جملے ایک دوسرے کے ساتھ گندھ کر آئے ہیں۔ سطروں میں یہ قرینہ بھی موجود ہے کہ وہ سارے بھید اور ان ساری روایات کی مہک کو بھی ان میں بس جانے دیا گیا ہے جسے اس علاقے کی مٹی نے یہاں کی کہانی کے خمیر کا حصہ بنایا ہوا ہے۔

کتاب کا نام ڈاکٹر تاج محمد رئیسانی کے خوبصورت براہوی افسانے ''انجیر نا پُھل'' سے لیا گیا ہے۔ اسی نام سے تاج رئیسانی کے براہوی افسانوں کا مجموعہ بھی آچکا ہے۔ افضل مراد نے جن دیگر براہوی کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اس مجموعے کا حصہ بنایا ہے ان میں ظفر علی مرزا کی ''چیخ، وحید زہیر کی ''ادھورے خواب''، ''آخری نظر'' اور عارف ضیاء کی ''بارش کی دعا اور ''چرواہے کے گیتوں کی محبوبہ'' اثیر عبدالقادر شاہوانی کی ''ڈاکٹر'' اور خود افضل مراد کی تین کہانیاں ''گمشدہ خطوط،'' آخری فیصلہ اور'' دوسرا سچ'' شامل ہیں۔ دشت کی وسعت، خشکابوں کی زرخیزی کے صدیوں پرانے گیتوں کی عاجزی، رشتوں میں بندھی اور خدمت پر

ماموں لڑکیوں کے نہ ختم ہونے والے دکھوں کا سلسلہ، گوارخ اور نیلی کے پھول، کوہ مردار کے دامن سے اٹھنے والی ماں کی چیخیں، چرواہے کے گیتوں کا سربستہ راز، بارشوں کے لئے فلک کی سمت اٹھتی ہتھیلیاں، غیرت کی آڑ میں ان راوایات کا قتل جو کبھی قبائلی مزاج کا عطر ہوا کرتی تھیں اور جسے اندھی ہوس نے ڈاکٹر کے نشتر کی بجائے ڈاکو کا خنجر بنا دیا ہے۔ بدلتا ہوا معاشرہ اور سیاسی شعور کا وہ آئینہ جس میں سیاست دانوں کا اصلی روپ صاف صاف جھلک دینے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ۔۔۔ اور بہت کچھ ان کہانیوں سے پھوٹ کر ہمارے جامد مزاج پر قدرے مختلف رنگوں کی پھوار برساتا ہے، یوں کہ ہم بہت دیر تک اس پھوار تلے بھیگتے رہنا چاہتے ہیں۔

پشتو کی صرف تین کہانیاں اس مجموعے کا حصہ بنی ہیں۔ در محمد کاسی کی ''۲۰۳۵''، نصیب اللہ سیماب کی ''آب حیات'' اور فاروق سرور کی ''پرندہ''، تاہم اپنے مزاج اور مہک کے اعتبار سے یہ ان پشتو کہانیوں سے مختلف ہو جاتی ہیں جو ادھر صوبہ سرحد میں لکھی جا رہی ہیں اور تواتر سے اردو میں ترجمہ ہو رہی ہیں۔ کوئٹہ چمن روڈ پر سسکتی زندگی کا نقشہ ہو یا بوجھ بن جانے والی قدیمی روایات یخ بستہ ہواؤں کی یورشیں ہو جن سے ہر منظر جم جاتا ہے یا خان کا وہ ڈیرا جہاں وقت قلانچیں بھرتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔ اپنے بچوں کے لیے لمبی حیاتی کی دعا مانگتی ماں کی ہتھیلیوں پر اگ آنے والا اشہادت کا سرخ پھول ہو یا وہ پرندہ جو کبھی بولتا تھا تو امن ہو جایا کرتا تھا، یہ کہانیاں پڑھتے ہوئے ہر واقعہ اور کہانی کا ہر موڑ تازہ تازہ اور مختلف لگتا ہے۔ بجا کہ کہیں کہانی لکھنے والوں کی معصومیت جھلک دینے لگتی ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سے مقامات پر کہانی خود اس بچے کی طرح معصوم ہو جاتی ہے جو اپنے ننھے منے پاؤں باپ کے بڑے بڑے بوٹوں نے ڈال کر بوسے کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

بلوچی زبان سے ترجمہ کی ہوئی کہانیاں پشتو اور براہوی کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ تیکھی ہیں۔ اس مجموعے کے لیے افضل مراد نے جن بلوچی کہانیوں کو ترجمہ کیا ہے، ان کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔ غنی پرواز کی دو کہانیاں ''تھوڑا سا پانی'' اور ''دس دس کے چار نوٹ'' صورت خان مری کی ''قتل رحم دلی'' پروفیسر صباد شتیاری کی ''کہاں سے آئے ہو؟'' منیر بادینی

وصف انہیں اس مجموعے کی براہوی اور پشتو کہانیوں سے مختلف کر دیتا ہے تاہم مٹی اور روایات کی ان کہانیوں میں بھی پوری طرح بسی ہوئی ہے۔

کہتے ہیں کہ ریورینڈ ربیسٹر نے پہلی پہل ۱۹۰۷ء میں براہوی کی سترہ کہانیاں اور ایک ناول اور آٹھ نظمیں جمع کی تھیں۔ اور اسی برس لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبان کے قدیم ادب کو یکجا کیا تھا۔ بلوچی، براہوی اور پشتو کہانیوں کے تراجم کا یہ مجموعہ مرتب کر کے افضل مراد قدیم روایات سے جڑ گئے ہیں۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ افضل مراد کی یہ کاوش بلوچستان ہی میں کہانی کے فروغ کے لیے انجیر کا پھول ثابت ہوگی۔ اور امید کی جانی چاہیے کہ اس کتاب کی اشاعت سے اردو افسانے پر بھی ایک نئے ذائقے کا دریچہ وا ہوگا۔

اس مجموعے کے افسانہ نگار

اثیر عبدالقادر شاہوانی: ۱۹۳۹ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ بلوچی، براہوی اور اردو کے شاعر اور نثر نگار۔ "آئینہ خاران" کے نام سے بلوچ سرداروں کی تاریخ مرتب کی۔ براہوی میں افسانے بھی لکھے۔ رابطہ بلوچی اکیڈمی عدالت روڈ، کوئٹہ۔

افضل مراد: اصل نام محمد افضل۔ شاعر، افسانہ نگار، مترجم، اردو، براہوی اور بلوچی کو تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا، متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات، کوئٹہ سے وابستگی۔ رابطہ: اکادمی ادبیات، پاکستان کوئٹہ۔

تاج رئیسانی (ڈاکٹر): اصل نام تاج محمد۔ ۱۵ اپریل ۱۹۵۷ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ براہوی زبان کے ادیب۔ براہوی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "انجیر نا پھل" شائع ہو کر قبولیت پا چکا ہے۔ ملازمت پیشہ ہیں۔ رابطہ: معرفت قلات پبلیشرز جناح روڈ، کوئٹہ۔

حکیم بلوچ: اصل نام عبدالحکیم۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو گرمکان پنجگور، مکران میں پیدا

ہوئے۔ حکومت بلوچستان کے اعلیٰ عہدوں پر فرائض منصبی ادا کیے۔ بلوچی افسانوں کی کتاب "چمن" اور بلوچی نثر کی کتاب "اوی چمن" شائع ہو کر توجہ پا چکی ہیں۔ رابطہ: مکان نمبر ۱۳ ریلوے ہاؤسنگ سوسائٹی، کوئٹہ۔

ر محمد کاکڑ: ۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ پشتو زبان کے افسانہ نگار ہیں۔ اسٹیج ڈراموں کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ رابطہ: پاکستان ٹیلی ویژن، کوئٹہ سنٹر۔

علی دوست بلوچ (ڈاکٹر): دس مئی ۱۹۵۵ء کو جکور میں پیدا ہوئے۔ بلوچی زبان کے شاعر، کالم نگار اور مترجم ہیں۔ رابطہ: بی۔ایم۔سی کمپلیکس، ڈاکٹرز فلیٹ بولان میڈیکل کالج، کوئٹہ۔

صبا دشتیاری (پروفیسر): مکمل نام غلام حسین صبا دشتیاری۔ گوادر میں لگ بھگ ۵۵ برس قبل پیدا ہوئے۔ شعبہ تعلیم سے وابستگی۔ بلوچی نثر کی کتاب "گل کار چمن کار" نے خاص توجہ پائی۔ رابطہ: شعبہ اسلامیات، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ۔

صورت خان مری: ۱۹۴۰ء کو مری ایجنسی کوہلو میں پیدا ہوئے۔ بلوچی کے افسانہ نگار و نثر نگار۔ کتب بلوچی نثر کی کتب "گشین" اور "روانگ" شائع ہو چکی ہیں۔ بلوچی اردو لغت بھی مرتب کی۔ رابطہ: روزنامہ آساپ کوئٹہ۔

ظفر علی مرزا: اصل نام ظفر علی ۱۲ اپریل ۱۹۳۵ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ ریڈیو کوئٹہ سے وابستگی۔ براہوی اردو ڈرامہ مرتب کی۔ براہوی میں افسانے لکھے۔ ۲۷ مارچ ۲۰۰۲ء کو وفات پا گئے۔

عارف ضیاء: اصل نام محمد عارف۔ ۱۹۵۳ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ براہوئی کے افسانہ نگار اور ادیب۔ براہوئی افسانوں کا مجموعہ "زراب" شائع ہو چکا ہے۔ رابطہ: پوسٹ بکس نمبر ۲۱، کوئٹہ۔

عزیز بگٹی (پروفیسر): اصل نام عزیز محمد۔ ۱۹۴۹ء کو ڈیرہ بگٹی میں پیدا ہوئے۔ شعبہ تدریس سے وابستگی۔ بلوچی نثر کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ رابطہ: ٹی بی سی کالونی، کوئٹہ۔

غنی پرواز: اصل نام عبدالغنی۔ تربت مکران میں پیدا ہوئے۔ عمر تخمیناً پچاس برس۔ ان کے بلوچی افسانوں کے مجموعے "سرنگل" نے خاص توجہ حاصل کی۔ دیگر موضوعات پر بھی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ شعبہ تعلیم و تدریس سے وابستگی۔ رابطہ: ڈگری کالج، تربت مکران۔

فاروق سرور: ۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ پشتو اور اردو دونوں زبانوں کے افسانہ نگار ہیں۔ اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رابطہ: ہدیہ پلازہ تھرڈ فلور، شارع اقبال، کوئٹہ۔

گوہر ملک: ضلع چاغی میں پیدا ہوئیں۔ بلوچی اور اردو کی افسانہ نگار تھیں۔ اپنے والد گل خان نصیر کے انداز فکر کو بلوچی نثر میں رواج دیا۔ ۲۳ فروری ۲۰۰۰ء میں انتقال کر گئیں۔

منیر بادینی: اصل نام منیر احمد بادینی۔ ۱۵ نومبر ۱۹۵۳ء کو گلی بادینی، نوشکی میں پیدا ہوئے۔ ملازمت پیشہ۔ نفسیاتی افسانے لکھے۔ بلوچی ناول "ریکانی گل حصے" شائع ہو چکا ہے۔ رابطہ: بی۔۱۸، جی او آر کالونی نزد چمن ہاؤسنگ سوسائٹی، کوئٹہ۔

نصیب اللہ سیماب: پشین میں پیدا ہوئے۔ پشتو زبان کے افسانہ نگار ہیں جامعہ بلوچستان میں پشتو زبان کے لیکچرار ہیں۔ رابطہ: پشتو ڈپارٹمنٹ، جامعہ بلوچستان۔

نعمت گچکی (ڈاکٹر): ۱۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو سوردو بنجگور مکران میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر۔ طب کے حکومتی شعبے میں اہم مناصب پر فائز رہے۔ بلوچی زبان میں افسانے کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ رابطہ: ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ بلوچستان، کوئٹہ۔

وحید زہیر: اصل نام عبدالوحید۔ ۳ جون ۱۹۲۱ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ براہوی اور اردو کے افسانہ نگار محقق نقاد اور خاکہ نگار۔ متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ براہوی میں ان کے افسانوں کے مجموعے "شنزہ" نے خاص توجہ پائی۔ محکمہ تعلقات عامہ حکومت بلوچستان سے وابستہ ہیں۔ رابطہ: کریم سائیکل ورکس، پرنس روڈ، کوئٹہ۔

بلوچی افسانے

گوہر ملک

... اور بلوچ نے مجھے دھکّا دیا

ہماری گاڑی سرسبز و شاداب باغات اور سبزہ زاروں کے بیچ صاف ستھری اور کشادہ شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا، "یہ کون سا علاقہ ہے؟"

"چاغی کا علاقہ" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کون سا؟ یہ ہمارا اور آپ کا بے آب ریگستانی چاغی ہے؟"

اس نے کہا، "ہاں!"

آخر چاغی تو بڑا چاغی ہے جو کوئٹہ سے لے کر افغانستان اور ایران کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے اس کا کون سا علاقہ ہے؟ میں نے پھر پوچھا۔

"تمام چاغی اسی طرح سرسبز اور آباد ہے" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"یہ خدا کی کیسی مہربان ہوگئی؟ کب ہوئی؟"

ڈرائیور نے ہنس کر کہا، "ماسی آپ کہاں رہی ہیں؟ میرے خیال میں آپ حضرت نوح کی دادی کی طرح خواب میں رہی ہیں جو دنیا کے حالات سے بے خبر ہیں۔ یہ سب ایٹم کی کرامات ہیں۔"

مکمل ہوتے ہیں۔''

ڈرائیور ہنس کر کہنے لگا، ''آپ بڑی سادہ ہیں۔ یہ سارے کارنامے قوم پرست اور وطن دوست وزیروں اور ممبروں کے ہیں۔ انہوں نے یہ تمام اسلام آباد کی خوشگوار آب و ہوا میں تصورات کے کارخانوں میں بنائے اور اپنی گردنوں کی طاقت سے انہیں یہاں لا کر تعمیر کیا۔''

''اس تیزی سے؟ میں نے کہا۔

''کھانے والے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے تم جتنا کھاؤ گے اتنی ہی تمہاری طاقت زیادہ ہوگی۔ تم اتنی بہتر کام کر سکو گی۔ پرانے لوگوں نے کہا ہے، وردن کھت گردن (کھانا کرتا ہے گردن موٹی) اسی کھانے کی طاقت ہے کہ دیکھو کہ اب کیا سردار اور کیا نواب، کیا ممبر اور کیا وزیر، کیا خان اور کیا ملک ہر ایک اسی کوشش میں لگا ہے کہ کھائے اور طاقت حاصل کرے تاکہ بلوچستان کے عوام کے لیے بہتر کام کر سکے۔'' ڈرائیور نے کہا۔

گاڑی کشادہ شاہراہ پر جا رہی تھی۔ پانی کے چشمے بہہ رہے تھے جہاں تک نظر جاتی، فصلیں تھیں گندم، جو، جواری اور چاول سے لیکر تربوز اور خربوزہ تک کون سی فصل تھی جو نہ تھے۔

''کیسے!''

''کیوں یہ کیسے؟'' ڈرائیور مجھ پر ناراض ہوا۔ ''تم اندھی ہو چکی ہو۔ روزانہ اخبارات میں نہیں پڑھتی ہو کہ ضلع چاغی میں زرعی انقلاب آ جائے گا، زرعی انقلاب اس کو کہتے ہیں۔''

مجھے خدا اندھا نہ کرے، اندھے ہوں میرے ملک کے دشمن اور بدخواہ۔ بہت دیر تک میں نے ڈرائیور سے بات نہیں کی مگر پھر پوچھا، ''یہ پانی کہاں آتا ہے؟'' ڈرائیور نے آنکھیں نکالتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا، ''راسکوہ سے۔''

''راسکوہ جل کر راکھ ہو گیا'' میں نے کہا۔

ڈرائیور سیٹ برابر کرتے ہوئے کہنے لگا، ''راسکوہ کیا کوہ طور ہے جو جل جائے گا اور کالا پڑ جائے گا؟ راسکوہ چاند اور سورج کی طرح روشن ہو چکا ہے اب راسکوہ سے میٹھے پانی کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ وہاں فیکٹریاں بنائی گئی ہیں اور وہاں اس پانی کو بوتلوں میں بند کر کے دنیا کے ہر

کونے میں فروخت کیا جاتا ہے۔ جو بھی اس پانی کو پیئے وہ کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ وزیر اعظم اس پانی کو بطور تحفہ امریکی صدر کے لیے لے جا چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ امریکی صدر اس سے بہت خوش ہوا اور ہمارے حکمران کے سارے قرضے معاف کر دیے۔"

راسکوہ اور خاران کے دیہاتوں کا پانی اور فصلیں کیسی ہیں؟

"کیا بات ہے جی وہاں کا انگور، ماش اور پیاز کیا بات ہے۔ ایک نہر جو راسکوہ سے نکلتی ہے۔ سارے خاران کو آباد کرتے ہوئے جاتی ہے۔ اب وہ خاران نہیں ہے جو کہتے تھے کہ "خاران جائے خوار۔"

ڈرائیور نے میری طرف بڑے غضب ناک ہو کر دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔

گاڑی میں شاید اور لوگ بھی سوار تھے لیکن میری طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ "مجھ پر غصہ نہ کرو تو میں تم سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔" ڈرائیور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ "غوری نامی میزائل مکران کے سمندر میں پھینکا گیا۔ کیا اس نے بھی اسی طرح کی آبادی کی ہے یا نہیں؟"

وہ خوش ہوا۔ "ہاں وہ بھی زبردست ہوا۔ "مکران دوری دوران انت" سمندر کی مچھلیاں تڑپ تڑپ کر پانی کی سطح پر آ رہی ہیں کہ آؤ ہمیں پکڑو، مقامی ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے اور بیچنے سے تھک چکے ہیں اور اب انہوں نے امریکیوں کو کہا ہے کہ وہ بے چارے آئیں اور اپنے لیے مچھلیاں پکڑیں اور لے جائیں کیونکہ ان کے ملک میں مچھلیاں نہیں ہیں۔ میرانی ڈیم کو دیکھو جو ایسا ڈیم ہے جس کے سامنے تربیلا کی کیا مجال ہے۔ یہاں سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب ہے۔ فکر نہ کرو ماسی، ایک دن تمہیں بھی مکران کی سیر کرانے لے جاؤں گا۔"

"کیچ و شہرک کے دیکھنے کو میرا جی بہت چاہ رہا ہے جو ماں کی سرزمین ہے لیکن اب میری ضعیف ہڈیاں کہاں گاڑی کے جھٹکوں کو برداشت کر سکتی ہیں۔"

ڈرائیور نے رحم بھری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بے چاری، مکران تو اب ریل گاڑی بھی جاتی ہے۔"

"اچھا!" میں حیران ہوئی اور خوشی سے چلا اٹھی۔ تمام سواروں نے میری جانب دیکھا جیسے میں پاگل ہوگئی ہوں۔

"اپنے بچپن میں جب میں کراچی گئی تب راستے میں پہاڑوں پر سفید نشانات کو دیکھ کر میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ ابا جان! یہ پہاڑوں پر کیسے نشانات ہیں، تو انہوں نے جواب دیا تھا، انگریز یہاں سے ریل گاڑی کی لائن کو چمن تک لے جانا چاہتے ہیں تو پاکستان بنا، اب ہم اپنے حاکم خود ہیں۔

"ہمیں کس کی حاجت تب۔ اب ہم خود اپنے حاکم ہیں۔" ڈرائیور گانا گانے لگا۔

"خودمختاری اسی کو کہتے ہیں۔ ہمارے رہنما کس طرح عوام کی خودمختاری، آسودگی اور ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کیسی کیسی گاڑیوں میں سوار ہیں، کیسے کیسے محلات میں رہتے ہیں۔" ڈرائیور نے خوشی اور فخر سے کہا۔

"کاش کہ وہ پرانے لیڈر زندہ ہوتے اور نئے لیڈروں کے کارناموں کو دیکھ لیتے تو کتنے خوش ہوتے کہ بلوچستان کس طرح آباد ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اچھا ہوا کہ وہ لیڈر مر گئے۔ جیل میں بیٹھنے اور سرکاری مفت کی روٹی کھانے کے علاوہ انہیں کیا لیڈری آتی تھی۔ عوام کو تو چھوڑو ان کے اپنے بچے بھوک اور فاقے میں تھے۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا ہوں۔ آؤ تمہیں اس کا گھر دکھاؤں۔" اس نے کہا اور گاڑی سبزہ زار سے مڑتے ہوئے ایک گرتی ہوئی دیوار اور کھنڈر جیسے گھر کے سامنے روک دی اور کہا، "اس گھر کو دیکھتی ہو؟ ان میں سے ایک لیڈر جیسے شاعر تھا۔ یہ اس کا گھر ہے۔" گھر کا آدھا حصہ زمین کے اندر اور آدھا باہر تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ تین کمرے تھے اور سامنے برآمدے میں بچوں کا شور تھا جو کسی کو قریب آنے نہیں دیتا تھا۔ اردگرد کچھ اور گھر بھی تھے لیکن ان کی حالت اس سے بہتر تھی۔ "کیا اس کے بچے ہیں اور اولاد ہے؟"

چہرے پر سوچیں لاتے ہوئے۔ تلخ لہجے میں اس نے کہا "مجھے کیا معلوم؟"

"اس نے کہا تھا کہ بلوچ میرے بچے ہیں بلوچ میری اولاد ہیں۔"

گوہر ملک

دادی کیوں تنہا ہے

"میں سارا دن یکا و تنہا، چڑیل کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہوں۔ حرام ہے اگر کوئی میری طرف آئے اور جھانک کر بھی دیکھے کہ میں مر گئی ہوں یا زندہ ہوں۔ بس روٹی کا ٹکڑا لا کر میرے سامنے پھینک دیتے ہیں۔ وہ گھر میں بندھے ہوئے کتے کے سامنے بھی اسی طرح روٹی کا ٹکڑا پھینک دیتے ہیں۔" دادی سب سے گلہ کرتی مگر کوئی سنتا ہی نہ تھا۔

ایک روز بیٹے کو ماں سے ہم دردی ہوئی اس نے ایک ریڈیو لا کر دیا اور کہا، "اماں تم تنہا بیٹھی رہتی ہو۔ یہ ریڈیو سنا کرو۔ بہت میٹھے ہوتے گیت اور نغمے بجاتا ہے بلوچی خبریں سناتا ہے۔ تمہارا وقت اچھا گزرے گا۔ میں نے کہا "ریڈیو کے گانوں کی بجائے تم لوگوں کو گھڑی بھر دیکھ لینا مجھے لاکھ درجہ اچھا لگتا ہے۔"

مجھے اس پر ترس آ گیا میں نے کہا "اچھا دادی اب میں روزانہ کام کاج سے فارغ ہوتے ہی تمہارے پاس آیا کروں گی اور بیٹھ کر اپنی سلائی کڑھائی کیا کروں گی۔"

دوسرے دن میں وعدے کے مطابق آ کر دادی کے قریب بیٹھ گئی دادی کی لاڈلی بہو نے جب مجھے دیکھا تو وہ بھی آ گئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ دادی نے کہا "آج کیسے راستہ

بھول گئی ہو؟" پھر میری طرف دیکھ کر کہا، "تمہیں دیر ہو گئی ہے۔" جانی مسکرائی۔ تھوڑی دیر
میں ننھی مہ گل دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی، "اماں اماں ابو کے بوٹ کہاں ہیں؟ ابو مجھے
اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔" ماں نے کہا "میز کے نیچے دیکھو۔"

بچی نے جواب دیا "میں نے ساری جگہیں دیکھ لیں، نہ تو مجھے کالے بوٹ ملے اور نہ
ہی سفید۔ میرے چپل بھی گم ہیں۔" ماں نے کہا "اچھا یوں کرو کہ میری چارپائی کے نیچے ڈبے
میں تمہارے نئے بوٹ رکھے ہیں۔ وہ پہن کر چلی جاؤ مگر دیکھو انہیں گندا نہیں کرنا۔" بچی واپس
مڑی اور بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

دادی نے کہا "ہاں بہن، جاؤ جا کر تلاش کرو۔ تمہاری ماں کے صندوق اور الماریاں
بوٹوں اور جرابوں سے بھری پڑی ہیں۔ سارے غریبوں اور ناداروں نے تمہاری جرابیں اور
بوٹ پہن رکھے ہیں مگر تمہارے اپنے پہننے کے وقت چیزیں گم ہو جاتی ہیں۔ تمہارا باپ جب دفتر
جاتا اور آتا ہے تو پورے راستے اس پر پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار روپے والے نوٹوں کی بارش
ہوتی رہتی ہے اور وہ انہیں چنتا رہتا ہے۔ پھر تم لوگ بھلا کیوں ان پیسوں سے بوٹ، جرابیں،
گاؤن اور فراک خرید کر تقسیم نہ کرو اور نام نہ کماؤ۔"

جانی کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور اس نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے کہا، "توبہ خدا،
توبہ۔ طعنہ زنی کے علاوہ کوئی بات نکلتی ہی نہیں۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ ابراہیم داخل ہوا۔ ابراہیم نے
ماں کو سلام کیا اور پوچھا "اماں آپ کیسی ہیں، ٹھیک ہیں؟" ماں نے سلام کا جواب دیا اور کہا،
"ٹھیک ہوں بیٹا مگر تم آج دفتر نہیں گئے کیا؟"

"آج کل دو دنوں کی چھٹی ہوتی ہے جمعہ اور ہفتہ کی۔ آج ہم ساتھی سنگت شکار پر
جا رہے ہیں" ابراہیم نے جواب دیا۔

"اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ یہاں تو کوئی بھی مجھے اپنی باتیں نہیں بتاتا نہ ہی میں نے
تمہیں جمعہ اور ہفتہ کے دنوں میں دیکھا۔"

ابراہیم نے وہیں سے آواز دی، "او جانی، وہ چیزیں میرے شکار والے بیگ میں ڈال

"۔

جان نے اندر سے جواب دیا، "یہ بیگ تو بیکار ہے اس کا زپ ٹوٹا ہوا ہے۔"

"بس چھوڑ دو۔ میں جا کر دوسرا خرید لاؤں گا۔"

دادی سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگیں، "بیٹا اس بیگ کو مرمت کروا لو۔ کیوں سو پچاس ضائع کرو گے۔"

"سو پچاس کہاں اماں، تین چار سو روپے۔ مگر اس کی مرمت میں دو تین گھنٹے لگیں گے۔ ساتھی سارے تیار بیٹھے ہیں" ابراہیم نے کہا۔

"تو پہلے دیکھا ہوتا۔ تمہاری بی بی جیسی بیوی نے دیکھا ہوتا۔ میں نہیں کہتی کہ پیسے لا کر مجھے دو یا چار جوڑے بنارسی کے مجھے پہنا دو یا چاول اور کباب اور تکے کر کے مجھے کھلا دو۔ تمہارا سایہ سلامت ہو میں تو ایک ٹکڑا روٹی کی مالک ہو کر رہ گئی ہوں۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ کچھ بچا کر رکھا کرو تاکہ ضرورت کے وقت تمہارے کام آئے گا۔ جیتے وقت تو سب ساتھ دیتے ہیں ضرورت کے وقت کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں رہے گا۔ مشکل کے وقت اپنا ہی کام آتا ہے۔ یہ بیوی تو تمہیں کسی دن محتاج کر کے چھوڑے گی۔"

"بیوی کا کیا قصور؟ مگر آپ اسے ضرور۔۔۔" ابراہیم ناراض ہو کر ماں کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دادی نے میری طرف منہ پھیر کر کہا، "دیکھو، میری اچھی باتیں ان کے لیے گویا گالی ہیں۔ بیوی کا نام سنتے ہی جیسے بجلی اس کے پیروں میں داخل ہو گئی ہو۔"

میں نے کچھ نہ کہا۔ اسی دوران حور جان آئی۔ دادی نے اس سے پوچھا تم نے کھانا کھا لیا؟ اور کس چیز کے ساتھ؟"

"میں نے روٹی نہیں کھائی۔ چاول قیمہ کھایا۔"

"مجھے نہیں یقین آتا۔ ابھی ابھی آئی ہو، اتنی جلدی لباس بھی تبدیل کیا اور کھانا بھی کھا لیا؟ تمہارا کھانا نہ ہوا چڑیا کا چگنا ہوا۔ میں دوسروں کے بچوں کو کھاتے دیکھتی ہوں تو حیران

رہ جاتی ہوں۔ اسی لیے تو وہ اتنی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔ تم اپنے ہم عمروں کے سامنے بہت چھوٹی لگتی ہو"

"بس اماں، تمہاری آنکھیں ہمیشہ دوسروں کے بچوں پر لگی رہتی ہیں۔ جتنا پیٹ میں جائے آدمی اتنا ہی ہوتا ہے۔ بڑے ڈاکٹر تو کہتے ہیں کہ بسیار خوری اچھی نہیں ہوتی۔"

"بکواس کرتے ہیں ڈاکٹر۔ تم لوگوں کے پیٹ تمہاری ماں نے بچپن سے خشک کر دیے ہیں۔ اس نے تم لوگوں کو کچھ نہ دیا۔ خود ہی اس نے تمہاری آنتیں سکھا دیں۔" وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولنے لگی۔ "تم کتنے دن سے سکول سے آ کر یہی بالی پہن رہی ہو؟ تمہاری ماں نے کتنے جوڑے خرید کر رکھے ہوئے ہیں؟ مگر تم اس قدر بدنصیب ہو تمہارے پہننے خدا نے تمہاری قسمت میں نہیں لکھے۔ پتہ نہیں کس صندوق یا الماری میں اس وقت تک پڑے رہیں گے جب تک کہ وہ تم سے چھوٹے نہ پڑ جائیں۔ تب تمہاری ماں انہیں اپنے عزیزوں رشتہ داروں کے بچوں کو دے گی۔"

حور جان نے ناراضگی میں اپنا سر ہلایا اور پھر سر کھجانے لگی۔

"تم اسکول میں بھی اپنا سر اسی طرح کھجاتی ہو؟ یہاں تو سارا دن تمہارا ہاتھ تمہارے سر میں ہوتا ہے۔ مجھے اپنے سر کو چھونے بھی نہیں دیتیں۔ تمہاری ماں کو تمہاری کنگھی چوٹی اور رشتہ داریاں نبھانے سے فرصت نہیں ملتی۔ صبح ہوتے ہی وہ مراثن کی طرح ایک گھر سے نکلتی ہے تو دوسرے میں گھستی ہے۔"

حور جان اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک لے گئی مگر دادی نے نہیں دیکھا۔ وہ بوڑھی دادی نے گھور گھور کر حور جان کو دیکھا اور کہا، "اس بدبخت پیسٹ برش نے ہزاروں لوگوں کے دانت چھیل کر کوتاہ کر دیے ہیں۔ ہمارے پاس پیسٹ اور برش نہ تھے اور ہم کنر نامی لکڑی کے کالے کوئلے کو پیس لیتے تھے۔ اس میں نمک ڈال کر ڈبوں میں رکھتے اور روزانہ اپنے دانت اس سے صاف کرتے۔ ہمارے دانت ہر وقت سفید ہوتے تھے۔ تم کہتی ہو کہ روزانہ دانت صاف کرتی ہو مگر تمہارے دانتوں پر تو زرد زرد تہہ جم گئی ہے۔ صاف کیے ہوئے دانت اس طرح ہوتے

ہیں؟"

"نہیں صاف کرتی، کیا کروں میں؟ تمہارے پاس بیٹھ کر آدمی بیزار ہو جاتا ہے۔" حور بان ناراض ہو کر چلی گئی۔

"نکال پھینک دو میری طرف سے۔ کبھی نہ صاف کرو۔ تمہارے دانت ہیں۔ سڑ جائیں گے۔" دادی اپنے آپ بڑبڑائی۔

اس دوران محمد آ گیا اور دادی کے گلے لگ گیا۔ "میری اچھی اماں کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہے؟ یہ حوری جو ہے نا، یہ میرے سمجھانے سے پاگل ہو جاتی ہے۔"

دادی نے محمد کا سر گود میں لیا اور ہاتھ سے اس کی پیشانی پر سے بال ہٹانے لگی۔ دادی نے کہا، "اپنا چہرہ دیکھو، کتنے دانے ہیں اس پر۔ یہ سب تمہارے نوچتے رہنے سے نکلتے ہیں۔ سارا دن تمہارے ہاتھ دانوں پر لگے رہتے ہیں۔ اپنا خوبصورت چہرہ کھرچتے رہنے سے تم نے اسے چیچک زدہ کر دیا ہے۔" محمد نے اپنا سر دادی کی گود سے اٹھایا اور وہ بالشت پر چڑھ بیٹھا۔ دادی نے اپنے بازو محمد کی گردن کے ساتھ حمائل کر دیے۔ اس کا ہاتھ اس کی قمیض کے کالر سے لگ گیا۔ کالر کو اس نے الٹا دیا اور کہا، "یہ تمہارا کالر کس قدر میلا ہے۔ لگتا ہے تم کبھی بھی اپنی گردن نہیں دھوتے۔"

"میں روزانہ نہاتا ہوں تو گردن کیسے نہیں دھوؤں گا؟" محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے سر پر تیل لگایا ہے۔ یہ تیل ہے۔"

دادی نے کالر مزید نیچے کر لیا۔ "ارے خانہ فرہنگ، تمہاری خوبصورت گردن کس قدر کالی پڑ گئی ہے۔ اگر اسے دھوتے ہو تو اچھی طرح رگڑتے نہیں ہو گے؟"

محمد ناراض ہو گیا اور آنکھیں نکال کر کہنے لگا، "تو کیا اپنی گردن کی کھال اتار دوں؟ بس میں گندا ہوں، میلا کچیلا ہوں۔ نہیں خود کو دھوتا بس، کیا کروں، جان سے مار دو مجھے؟"

اس نے دادی کا بازو زور سے اپنی گردن سے الگ کر دیا اور کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیزار کر دیا تم لوگوں نے مجھے۔"

"میں نے تمہارا کیا بگاڑ دیا ہے کہ تم نے اس طرح میرے بازو اپنی گردن سے دور جھٹک دیے۔ بیٹا، ابھی میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو تم سے یہ سلوک ہو رہا ہے۔ اگر میں مفلوج اور اپاہج ہو جاؤں تو تم لوگ تو مجھے اسی دن گھسیٹ کر سڑک پر پھینک آؤ گے۔" دادی نے فریاد کی۔

احمد نے دادی کی آواز سنی تو دروازہ ذرا سا کھولا، جھانکا اور مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔ آخر وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے پرانے زمانے کی ڈھیلی ڈھالی قمیض شلوار پہن رکھی تھی۔ ٹوپی پہنے ہوئے اس نے کھڑے کھڑے اپنے لباس کی طرف اشارہ کر کے مجھے دیکھا۔ میں نے بھی سر کے اشارے سے کہا کہ بہت اچھے لگتے ہو۔ پھر اس نے دادی سے پوچھا۔

"بی بی کیوں چپ ہو؟"

"کیا کہوں؟"

"میرا لباس کیسا لگ رہا ہے؟"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔ تم لوگ جانو، تمہارا کام جانے۔ میں بات کرتی ہوں تو تم لوگ میرا گلہ دبانے آتے ہو۔ اب یہ کوئی لباس ہے جو تم نے پہن رکھا ہے؟ جیسے جمعہ خان کے چرواہے کا لباس ہو۔ اس سے تو تم پر یہ ہلکے رنگ والا جوڑا بہت اچھا لگتا ہے۔"

"یہ فیشن ہے! میرا لباس تو پھر بھی چھوٹا ہے۔ لوگ تو دس دس میٹر کی شلوار سلوانے لگے ہیں۔"

"جو کوئی بھی جھک مارے تو وہ "فیشن" ہو گئی بہت بے فکر   " اس نے ایک گندی ضرب المثل سنائی۔

"اماں بی بی! کوئی چیز تو بتاؤ جو اچھی ہو؟"

"میں نے تم لوگوں میں کوئی اچھی چیز دیکھی ہی نہیں۔ اب اس اتنے بڑے لباس کی روزانہ کی دھلائی اور استری دیکھو تو تمہاری ماں کی چیخ پکار اور صلواتیں ہوں گی۔ اسے کون دھوئے گا اور کون استری کرے گا؟"

''آپ فکر نہ کریں۔ اسے مشین دھوئے گی اور استری میں خود کروں گا۔ میں خود'' اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔

دادی طنز سے ہنسی۔ ''ہاں ہاں احمد اور استری؟ کل میں نے غسل خانے میں پڑا ایک کپڑا دیکھا۔ جب اٹھا کر دیکھا تو تمہاری بنیان تھی اس قدر میلی چیکٹ کہ کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ بھی کبھی سفید رنگ کی رہی ہوگی۔ تم اپنا بدن نہیں دھو سکتے۔ بات کرتے ہو کپڑے دھونے اور استری کرنے کی۔''

''بس بس اماں! تم سے بات کرنا گناہ ہے۔''

''مت کرو تم لوگ مجھ سے بات۔ میں تو بوڑھی ہوں اور بوڑھی تم دونوں کو پسند نہیں۔''

احمد کی ماں آئی اور کہنے لگی، ''احمد تمہیں تمہارا باپ بلا رہا ہے'' احمد نے ناراضگی میں اپنا سر جھٹک دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ احمد کی ماں آ کر بیٹھ گئی کہنے لگی:

''آج بہت تھک گئی ہوں۔ جھاڑو دینے میں لگی رہی ہوں۔ ان دو دنوں سے چلنے والی ہوا نے سارا گھر مٹی سے بھر دیا تھا۔''

''ہمیں غرض نہیں ہے، اپنی تھکن مت جتاؤ'' دادی نے کہا۔ ''میں بات کرتی ہوں تو کہتی ہو کہ تم میرے بیٹے نوکر نہیں چھوڑتی ہو انہیں بھگا دیتی ہو۔ تمہارے اگر دس نوکر بھی ہوں نا تب بھی تمہارا کام تمہارے اپنے سر ہوگا۔ اب تمہارا یہ نوکر جو ہے ناں، جب جمعرات کی شام ہوتی ہے تو تم اس سے کہتی ہو، جا وے بے چارے، کل جمعہ ہے تمہیں چھٹی ہے۔'' وہ نہیں کہتا کہ مجھے چھٹی دیدو، مگر تم زبردستی اسے بھیج دیتی ہو، نہ اس کی ماں ہے نہ باپ، ایک بھائی ہے جو طالب ہے اور مسجد میں پڑا ہے۔ ہزار جی جان سے کہتی ہوں اسے یہ لڑکا کون سا کما دکھاتا ہے؟ میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھ سے ہزار نخروں سے بات کرتی ہو مگر نوکروں کے سامنے بچھ جاتی ہو۔ آخر ہم بھی اپنے زمانے میں بی بی رہے ہیں۔ ہمارے بھی نوکر تھے۔ ہم آنکھ اٹھاتے تو نوکروں کا پیشاب نکل جاتا تھا۔''

احمد کی ماں نے کہا، ''اماں! اب زمانہ بدل چکا ہے۔ وہ وقت اور تھا۔ اب تو نوکر آنکھ

خانے میں تو مائن کا پیشاب نکل جاتا ہے۔"

"میں دوسروں سے نوکر بھی دیکھتی ہوں۔ کسی نے نوکر ڈبے اور سر پر بٹھائے ہوئے نہیں ہیں۔ اصل میں تمھیں نوکر رکھنا ہی نہیں آتا۔"

"میں تو یہاں پہلے سے نوکر بھی رکھ رہی ہوں، میں نوکر رکھنا کیا جانوں؟" حمدی ماں ناراض ہوگئی۔

"واہ، یہ ناراض ہونے کی بات ہے کہ تم پاگل ہوئی جا رہی ہو؟ جانے میری اچھی باتوں سے تم لوگوں کو اتنی چڑ کیوں ہو جاتی ہے؟"

"میں یہاں آئی تھی کہ ذرا سا دم لے لوں مگر تم انسان کو آرام سے کہاں چھوڑتی ہو؟ تمہارے منھ میں طعنہ اور چوٹ کے علاوہ کوئی اور اچھی بات ہے؟ اسی وجہ سے دور کر چکی ہو، ہر شخص تم سے دور بھاگتا ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ زمین پر ٹیک دیے، اف کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اٹھ چکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جاتی ہوں، ذرا سا ٹانگیں سیدھی کر لوں، بیٹھوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں اور دادی اکیلے رہ گئے کہ میں بھی بیزار ہوگئی۔ "دادی ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں؟"

"مجھے پتہ ہے کہ تم بری بات نہیں کرو گی" دادی نے کہا۔

میں نے دادی کی منت کی اور کہا، "تمہارے بچے اب خدا کے فضل سے بڑے ہو گئے ہیں۔ اب تم ان کے ہر کام میں دخل نہ دو۔ ان کے لیے دعا کرو کہ خدا انہیں برے کاموں سے دور رکھے۔ خدا ان کی مصیبت اور غم تمہیں نہ دکھائے۔ جب تک بچہ چھوٹا ہوتا ہے اور ماں باپ کا محتاج ہے، وہ بات مانتا ہے۔ جو چیز اسے کھلا دی جائے کھاتا ہے۔ جو چیز اسے پہنا دیا جائے پہنتا ہے، مگر جب وہ خود ماں باپ بن جاتے ہیں تب تمہیں ان کے پیار اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم ان کے کام اور خدمت کی محتاج ہو جاتی ہو تم ان پر بے جا تنقید نہ کیا کرو۔ وہ جب

بھی تمہارے پاس آتے ہیں تو تم کہتی ہو، یہ چیز خراب ہے تم، گندے، ہو، نہاتے نہیں، اب وہ تمہاری نصیحت نہیں مانتے۔ وہ تم سے نیک دعا چاہتے ہیں۔ میری تمہاری پچاس سال پرانی باتیں وہ اب نہیں مانتے کہ شلوار کو یوں کرو، لباس کو اس طرح پہنو۔"

دادی کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔ اس نے بالشت کو برابر کیا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں نے بھی اپنا سوئی دھاگہ، پیٹا اور باہر نکل آئی۔ اب میں سمجھی کہ دادی کیوں تنہا ہے!

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی

کیا یہی زندگی ہے؟

ہوا میں تلوار کی سی کاٹ پیدا ہوئی تھی۔ جھکڑ نے طوفان برپا کر رکھا تھا۔ درختوں نے خزاں کی کالی چادر اوڑھ لی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گئے موسموں کا سوگ منا رہے ہیں۔ کوئی کیا جانے یہ کیوں سوگوار ہیں۔ راتوں کی سیاہی اب دن میں بھی نظر آتی ہے۔ پرندے، ہواؤں کی اڑتی مخلوق، اپنے گھونسلوں میں پناہ لیے ہوئے اپنی جمع کی ہوئی پونجی پر زندگی بسر کر رہے تھے۔

بوڑھی دادی اماں نے خستہ لحاف سے جھانکتے ہوئے آواز دی، ''گلو جان، دیکھنا تو سائے اُدھر چپٹ پڑے ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو میری نماز سردی کی بھینٹ چڑھ جائے۔'' گلو جان نے جواب دیا، ''بڑی اماں سائے لوٹ رہے ہیں۔ ہوا کا زور بھی ٹوٹ رہا ہے۔ آپ کی نماز کا وقت ہو چکا ہے۔''

''ہاں بیٹے، سردی کی شدت گھٹنے لگی ہے تو بادلوں نے سر اٹھا لیا ہے۔ خدا ہم بے گھروں، کپڑے لتے سے محروم انسانوں پر رحم فرمائے۔ کیا کی ٹوٹی پھوٹی ہوئی چھت تو ابھی سے ڈرانے لگی ہے۔'' دادی اماں نے غم آلود لہجے میں کہا۔ پوتے نے ایک زوردار قہقہہ بلند کرتے ہوئے بتایا، ''دادی جان آپ کا تخت تو صاف سے باہر جھانک رہا ہے آپ نے یہ لحاف کب بنایا''

"وہیں نمک دانی میں دیکھو۔ اندر پڑی ہے۔ میرا دماغ مت چاٹو" صدو نے جھڑک دی۔

"اماں اس میں تو نمک نہیں ہے" لڑکے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ذرا سوکھ دان میں بھی دیکھ لو۔ اگر اس میں بھی نہیں تو مجھے نمک کے انگاروں پر رکھ دو"

"ماں" لڑکا ایک مرتبہ پھر پکارا "روٹی کا ایک نوالہ رکھ دیں۔ میں گوشت کے ساتھ کھاؤں گا۔"

بشیرک نے صدو سے کہا "ہوا میں بجلی کی شدت نہیں رہی۔ تم میری چادر اوڑھ کر میرے ہاں چلی جاؤ۔ تھوڑی سی کھجور، نمک لے لو۔ آج رات مجھے لکڑی کاٹنے جانا ہے۔ میرے ہاں لکڑی ختم ہوگئی ہے۔"

سورج مغربی افق پر جھک رہا تھا۔ جنوب کی طرف سے کالے کالے بادل جھوم جھوم کر بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سورج غروب ہوگیا۔ اندھیرا بڑھ گیا، بادلوں نے بڑھ کر سارے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ ایک تو رات کی تاریکی پھر بادلوں کی سیاہی، گھور اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر بوندا باندی اور جل تھل بارش ہوئی۔ اولے تڑتڑانے لگے۔ بارش نے تو وہ سماں باندھا کہ جیسے آج ہی ٹوٹ کر برسنا ہے۔ مویشیوں نے سہم کر زور زور سے ممیانا اور ڈکرانا شروع کر دیا۔ امیر اپنے پکے گھروں میں اور غریب اپنے خستہ جھونپڑوں میں پھٹے پرانے کپڑوں میں دانت بجا رہے تھے۔ بارش رک گئی۔ جانوروں کی آوازیں آنی بند ہوگئیں مگر اب بھی کہیں کہیں سے ان بے نواؤں کے کراہنے کی آواز آتی جو اپنی گری ہوئی جھونپڑیوں سے آگ کی تمنا لیے دانت بجاتے، بغلوں میں ہاتھ دیے، سمٹے ہوئے سردی کا دکھ جھیل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ مثال درست ہے کہ "گلابی جاڑا بھوکے ننگے لوگوں کی رضائی ہے۔"

رات ٹوٹتی رہی۔ دوسرا پہر گزرا، مرغوں نے اذانیں دینا شروع کیں۔ صدو رات بھر

مارے سردی کے سو نہ سکی۔ مرغوں کی اذانیں سن کر اٹھی اس لیے کہ امیروں کے گھر کا سے اناج پیسنا تھا۔ وہ ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے باہر گئی۔ ایشرک بھی سردی کے مارے سکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ باہر سے ایک دلدوز چیخ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور دوڑ کر باہر آیا دیکھا تو صدو مٹی میں لوٹ رہی ہے۔ ایشرک نے اپنے دکھوں کے ساتھی کو سہارا دے کر اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا جھونپڑے میں لے آیا۔ "تجھے کیا ہوا؟" ایشرک نے صدو سے بے تابانہ پوچھا۔ "کیوں اتنے زور سے چیخی ہے؟"

"کیا بتاؤں۔ سرد ہوا کے ایک تھپیڑے نے میرے ہوش اڑا دیے۔ میرے ہاتھ پاؤں جم گئے ہیں" صدو نے اپنے ٹھٹھرتے ہاتھ پھیلا دیے۔ ایشرک جھونپڑے کے ایک کونے کی طرف گیا جہاں بچے گودڑ میں سمٹے، چمٹے ہوئے سو رہے تھے۔ وہاں کچھ لکڑیاں پڑی تھیں مگر جھونپڑے میں بارش کا پانی در آیا تھا اور وہ سب کی سب بھیگ چکی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر تلاش کیا اور کھجور کے پتوں کا بنا ہوا ایک تھیلا اٹھا لایا۔ صدو سے پوچھنے لگا۔ "ماچس کہاں رکھی ہے؟"

"ماچس میں ایک تیلی رہ گئی تھی۔ کل لڑکے نے آگ جلا کر ختم کر ڈالی۔ "میں نے آگ سلگائے رکھنے کے لیے اپلے سلگائے تھے مگر بارش نے بجھا ڈالے۔" صدو کا یہ الجھا جواب سن کر ایشرک کی آنکھیں بھر آئیں۔ مجبوراً اس نے صدو پر پھٹی پرانی رضائیاں ڈال دیں۔ وہ اپنے اوڑھنے بچھونے صدو پر ڈال کر بولا۔ "اچھا میں اب چلتا ہوں۔ جب تیرے بدن میں کچھ جان پڑے تو اٹھ کر میرے گھر کا اناج پیس ڈالنا۔ صبح اگر وقت ملے تو میرے گھر سے لایا ہوا وہ دھان بھی کوٹ کر صاف کر دینا جو میں نے کل بھجوایا ہے۔ میں شاید دیر سے لوٹوں، وہ خوانخواہ خفا ہوگا۔"

بارش تھم چکی تھی مگر ہوا غضب میں بھری ہوئی تھی۔ ایشرک نے کندھے پر کمبل کسا۔ اپنے بوجھل جوتے پہنے۔ پرانی کمبل کھینچی تاکہ اسے اوڑھے مگر چھوٹا چیخ چیخ کر رونے لگا۔ باپ نے پوچھا۔ "بیٹے کیا بات ہے کیوں روتے ہو۔ کچھ تکلیف تو نہیں؟"

وہ بولا۔ "نہیں بابو مجھے تو سردی نے مار ہی ڈالا ہے مجھے کپکپی ہو رہی ہے کچھ اوڑھا دو۔"
اس کے دانت بج رہے تھے۔ ایشرک نہایت پریشان تھا۔ ایک طرف بچے کے رونے اور

بلبلانے کی آواز، باہر ہوا کا دل میں اترتا شور۔ اولاد کا پیار اپنی راحت پر غالب رہا۔ چنانچہ وہ کمبل بچے کو اچھی طرح اوڑھا کر، آدھی رات کو ٹھنڈ سے اکڑ کر وہ گھر آیا۔ وہ ایک قدم اٹھا کر وہ رکا اور اپنی بیوی کو آواز دے کر پوچھنے لگا، ”ارے صدو! کل جو میں نے تجھے میر کی ماں سے کھجور مانگ لانے کو کہا تھا۔ کچھ دیا اس نے؟“

”جی، میں تو منھ کھول کر پشیمان سی ہوئی تھی۔ کھجور اس نے دیا تو تھا۔ سو باتیں سنا کر میری سات پشتیں تو مزہ لیں“ صدو نے رضائی کے اندر سے بڑبڑا کر کہا۔

بشیر کمرے پر بیٹھا اور جنگل کی راہ لی۔ جسم پر صرف میلا کچیلا ایک چیتھڑا پہنے وہ ہوا کے تند و تیز تھپیڑوں سے اس کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ ہمیشہ جس طرف جایا کرتا اسی سمت ہولیا۔ صبح کا گیا وہ شام کو وقت آتا مگر اب کی بار وہ گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔

صبح ہوئی۔ صدو نے چکی پیس کر ایک طرف رکھی اور اپنی گھٹی ہوئی آنکھیں اس کی اس کے لحاف پر جمائیں۔ بڑھیا ابھی تک کی سمٹی پڑی ہوئی تھی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ اتنی دیر تک کبھی بھی نہیں سوئی۔ وہ اپنی ساس کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔ اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے لگی۔ مگر وہ تو ایسا سوئی تھی کہ جاگنے سے رہی۔ وہ اپنے پھٹے پرانے لحاف میں سب کی دوسری دنیا کو سدھار چکی تھی۔ صدو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی ہوش اڑا دینے والی چیخ فضا میں گونجنے لگی۔ پاس پڑوس کے لوگ سمٹ کر آ گئے۔ ”ارے اب کے بڑھیا کو کیا ہوا؟ کیا ہو؟“ کے شور میں صدو کو کہتے ہوئے سنا گیا ”بہو، ہونا کیا تھا۔ وہی ہوا جو غریبوں کا مقدر ہے۔ ناداری کا دکھ کوئی کب تک برداشت کرے۔ اسے سردی نے ہم سے چھین لیا ہے۔“

بشیر کتنا بدنصیب تھا کہ اسے ماں کا آخری دیدار بھی نہیں مل سکا۔ خدا ترس لوگوں نے بڑھیا کا کفن دفن کیا اور اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے۔ صدو سر پر ہاتھ رکھے بین کرتی رہی۔ ابھی ساس کی موت کا غبار کم نہیں ہوا تھا کہ ایک پڑوسن دوڑتی ہوئی آئی اور چیخ کر کہنے لگی، ”بدقسمت صدو! افسوس تیری حالت پر، تو بڑھیا کے لیے بین کر رہی ہے اور موت نے تجھ سے

تیرے بچوں کے سر کا سایہ بھی چھین لیا ہے۔ اشرف شدید سردی میں سکڑ کر بھری دنیا میں تجھے اکیلا چھوڑ گیا۔ ایک قافلے کو گزرتے ہوئے راستے میں اس کی لاش پڑی ملی ہے، وہ اسے اٹھا لائے ہیں۔" یہ سنتا تھا کہ صدو پر گویا بجلی گر گئی۔ اس کا گلا رندھ گیا اور اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ گئے۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتوں نے اسے اٹھا کر ایک کونے میں بٹھا دیا۔

ہر سال اسی طرح سردیوں کا بے رحم موسم آتا ہے۔ اسی طرح ہوا پُر شور ہو جاتی ہے۔ اولے تڑ تڑ برستے ہیں۔ اور اسی طرح درختوں میں سنسناتی ہوائیں اشرف کا سوگ مناتی ہیں۔ اور اسی طرح نہ جانے کتنی صدو بیوہ ہو جاتی ہیں، ہزاروں معصوم بچے غربت کا دکھ سہنے کے لیے یتیم ہو جاتے ہیں۔

غنی پرواز

تھوڑا سا پانی

دنیا اس کے غیر متوقع انجام پر سخت حیران   اور اس بات پر اور زیادہ حیران تھی کہ آخر اس غیر متوقع انجام کی سب سے بڑی وجہ کیا تھی؟ آیا اس کی سب سے بڑی وجہ بڑے بھائی کی کوششیں تھیں؟ یا اس کی اپنی کارکردگی؟

البرٹ اور ساشا کا باپ کی طرف سے آپس میں بھائی تھے لیکن ان کی مائیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ دونوں کا باپ یہودی تھا، لیکن البرٹ کی ماں بلونڈ تھی اور ساشا کی ماں جینی۔ البرٹ بڑا تھا اور ساشا چھوٹا۔ البرٹ کی شکل بری نہ تھی لیکن ساشا کی شکل بہت اچھی تھی۔ البرٹ ہر کام دائیں ہاتھ سے کرتا تھا اور ساشا ہر کام بائیں ہاتھ سے۔ جب انہیں اپنے برے بھلے کی تمیز ہوئی تو وہ اپنے والدین سے علیحدہ ہوگئے۔ والدین کو ان کی علیحدگی سے دکھ تو ضرور ہوا لیکن اس بات پر وہ مطمئن بھی تھے کہ ان کے بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو چکے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ دونوں بھائی محنت مزدوری کی غرض سے دور دراز علاقوں میں چلے گئے۔ البرٹ مغرب کی جانب چلا گیا اور ساشا مشرق کی جانب   اور ایک طویل عرصے کے بعد جب وہ واپس آئے تو معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے کس طرح کمایا تھا اور کیا کیا کھایا تھا،

مگر یہ بات اچھی طرح سے محسوس کی گئی کہ دونوں امیر بھی ہو گئے تھے اور تنومند بھی، اور ان کی شکلوں میں عجیب و غریب تبدیلی بھی آ چکی تھی۔ البرٹ کی شکل ہاتھی جیسی ہو گئی تھی اور ساشا کی شکل گھوڑے جیسی۔

البرٹ نے اپنی دولت سے کارخانے کھولے اور ان سے دولت میں اضافہ کرنا شروع کیا جب کہ ساشا نے اپنی دولت سے مکانات بنوائے اور انہیں کرائے پر دے کر ان کے کرایوں سے دولت پیدا کرنا شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ دونوں اتنے امیر ہو گئے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن خود ان کے مابین بے اندازہ رقابت پیدا ہو گئی۔ اس لیے دونوں نے ایک دوسرے کا سخت مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے لیے ہر قسم کے جائز، ناجائز ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ان دونوں کے ہمسایوں میں بعض نے البرٹ کی حمایت کی اور بعض نے ساشا کی۔ بعض نے البرٹ کی طرح کارخانے کھولے اور بعض نے ساشا کی طرح مکانات بنوائے۔

جب البرٹ اور ساشا کے کاروبار ترقی کر گئے تو انہوں نے اپنے اپنے کاروبار کی حفاظت کے لیے فوجیں جمع کیں۔۔۔ اور ان افواج کو اپنے کاروبار کو فائدہ پہنچانے اور دوسرے کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کے لیے اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کے خلاف اور ایک دوسرے کے دوستوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس لیے ان کے مابین اور ان کے دوستوں کے مابین لڑائی جھگڑے بڑھتے ہی چلے گئے اور ان لڑائی جھگڑوں نے کبھی کبھی بہت طول بھی کھینچا۔ کاروبار اور لڑائی جھگڑوں میں کبھی البرٹ جیت جاتا اور ساشا کو شکست ہوتی تو کبھی ساشا جیت جاتا اور البرٹ کو شکست ہوتی۔ لیکن ایک دن، ساشا کے دل میں نجانے کیا خیال آیا کہ اس نے اپنی افواج کو اپنے دوستوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا اور پھر انہیں مسلسل کئی دنوں تک اپنے دوستوں کے خلاف استعمال کرتا رہا۔ شاید اس کے دل میں اپنے دوستوں کی وفاداری پر شک پیدا ہوا تھا۔ اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک صبح، جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اس کی شکل گھوڑے جیسی سے تبدیل ہو کر ریچھ جیسی بن گئی تھی۔ اس بات کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک رات ایسا زلزلہ آیا کہ اس سے ساشا کے سارے مکانات مسمار ہو گئے اور وہ

فقیر بن کر رہ گیا، لیکن البرٹ کے کارخانوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔

ساشکا کو بہت دکھ ہوا، اور وہ بہت اداس ہو گیا۔ کچھ عرصے تک تو وہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا اور کسی نہ کسی طرح اپنا وقت گزارتا رہا لیکن آخر کار مجبور ہو گیا اور سیدھا البرٹ کے پاس پہنچ گیا۔

"میرے قابل احترام بھائی، مجھ سے بہت زیادہ غلطیاں ہوئی ہیں اور میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادہ گستاخیاں کی ہیں۔ آئندہ نہ تو مجھ سے ایسی غلطیاں ہوں گی اور نہ گستاخیاں کروں گا، لیکن اس بار مجھے معاف کر دیں۔"

البرٹ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ذریعے ہمدردی سے ساشکا کا سر اوپر اٹھایا۔ جب ساشکا کا سر اوپر اٹھ گیا اور اس کا چہرہ اچھی طرح سے نظر آ گیا تو البرٹ نے دیکھا کہ ساشکا کی آنکھیں اشک آلود ہیں۔ اس نے اپنے رومال سے ساشکا کے آنسو پونچھے اور اسے دلاسا دیتے ہوئے نرمی سے کہا:

"پریشان نہ ہو۔ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" پھر ذرا سوچ کر کہا، "اگر تم میری محتاجی اور تابعداری قبول کر لو تو اس بار تمہارا سارا قصور معاف کیا جا سکتا ہے۔"

ساشکا اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور عاجزی سے بولا:

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے مجھے آپ کی محتاجی اور تابعداری قبول ہے اور میں ہمیشہ آپ ہی کی ہدایات پر عمل کرتا رہوں گا۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر محبت سے البرٹ کی جانب دیکھ کر بولا: "لیکن آپ مجھ پر رحم کریں۔ میں معاشی طور پر فقیر بن چکا ہوں۔ اس لیے مجھے اپنی خیرات و حسنات سے محروم نہ کریں اور کچھ قرضے بھی دے دیں تاکہ میں کوئی کاروبار کر سکوں۔"

اپنی بات مکمل کرتے ہی ساشکا کو یوں محسوس ہوا جیسے البرٹ پہلے کی نسبت جسمانی لحاظ سے زیادہ تنومند اور شکل کے لحاظ سے زیادہ خوش نما ہوتا جا رہا ہے اور اسی اثناء میں البرٹ کو یوں محسوس ہوا جیسے ساشکا پہلے کی نسبت جسمانی لحاظ سے زیادہ کمزور اور شکل کے لحاظ سے زیادہ بدنما

ہوتا جا رہا ہے۔۔۔

جب ابرٹ نے ساشکا کو معاف کیا اور اس کی فریاد سن لی تو ساشکا ابرٹ سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا، اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ کافی دیر تک جاگنے اور سوچتے رہنے کے بعد اسے نیند آ گئی۔ اور وہ اتنی گہری نیند سویا کہ باقی ماندہ دن اور آنے والی پوری رات نیند میں گزر گئی۔ اگلے دن دوپہر کے وقت بیدار ہوا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے دیکھا کہ اب وہ پہلے جیسا تنومند آدمی نہیں رہا بلکہ سکڑ کر اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو خود بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے چاہا کہ جا کر اپنے آپ کو کسی آئینے میں دیکھے مگر نہ تو وہ اپنی سابقہ رفتار سے چل سکتا تھا اور نہ اپنے آپ کو کسی آئینے میں دیکھ سکتا تھا۔ اسی کوشش میں وہ پلنگ سے پھسل کر پلنگ کے سامنے رکھی میز پر گر گیا اور میز پر رکھے شیشے کے گلاس سے جا ٹکرایا جس کے پیندے میں تھوڑا سا پانی رہ گیا تھا۔

اچانک اس نے اپنا دھندلا سا عکس اسی گلاس پر دیکھ لیا اور حیرت کے مارے اچھل کر رہ گیا کیونکہ وہ ایک بھونرا بن چکا تھا ....

غنی پرواز

دس دس کے صرف چار نوٹ

''ہاں، آ رہا ہوں'' رئیس نے جواب دیا اور جلدی جلدی بڑے کے دروازے کی طرف گیا۔ دروازے پر موجود شخص اس کا پرانا واقف کار رحمت شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی رئیس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں کیونکہ نئے مہینے کے کنٹرول کے گندم اور چینی کا کوٹا آ گیا تھا لیکن اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ کل سے اس پر پریشان تھا کہ پیسے کس طرح اور کہاں سے حاصل کرے؟ کس سے قرض لے؟ وہ اپنے قریبی واقف کاروں کے پچھلے قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اب پتہ نہیں اسے مزید قرض ملتا یا نہیں؟

یوں تو وہ ایک زمیندار تھا، چاہیے تو یہ تھا کہ اسے کھانے اور کپڑے لتے کے لیے قرض کی ضرورت نہ پڑتی۔ پہلے تو اسی طرح ہوتا تھا۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ٹھیک تھا ہر چند کہ اس علاقے کے حالات خراب تھے اور عام لوگ طرح طرح کے مسائل کا شکار تھے تاہم اس کا گزارہ کسی نہ کسی طرح سے ہو جاتا تھا مگر کم و بیش دو برس کے عرصے سے حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ لوگوں پر متعدد نئی مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں، متعدد نئے قہر ٹوٹ رہے تھے۔

ہر دوسرے تیسرے سال برسات سے کھجور کی فصل کی تباہی کی بات پرانی ہو گئی۔ پانی نہ

ہونے کے باعث سوکھی زمینوں پر فصل نہ اگنے اور قحط پڑنے کی بات پرانی ہوئی۔ جہنگ، کیچ کور اور دوسری ندیوں میں سیلاب کی وجہ سے مال و جانی نقصان بھی پرانی بات تھی۔ کام اور ملازمتوں کی کمی اور ان کے نہ ملنے کا مسئلہ بھی نیا نہ تھا۔ عرب ریاستوں سے محنت مزدوری کر کے کمائے مال و اسباب کی لوٹ مار، جانوروں کی غیر ممالک میں اسمگلنگ کے باعث جانوروں کی قیمتوں اور گوشت کے نرخ میں اضافہ، جانوروں اور گوشت کی مہنگائی کے سبب مرغیوں، انڈوں، مچھلیوں اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں کے نرخ پر پڑنے والے برے اثرات، کوئٹہ، کراچی اور دوسرے شہروں سے دوری کے سبب ہر قسم کی چیزوں کی مہنگائی، طرح طرح کے علاقائی چندوں اور اسی نوعیت کے کئی دوسرے مسائل کے قصے ہمیشہ سے موجود تھے جنہوں نے لوگوں کے حالات خراب کر دیے تھے۔

نئے قہر اور مصائب کے قصے پھر بھی اور تھے، جو کھانے پینے کی زیادہ تر چیزوں کی نایابی سے شروع ہوئے تھے۔ سب سے پہلے گندم اور چینی، اور پھر چاول غائب ہو گئے اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے بناسپتی گھی اور پیاز بھی غائب ہو گئے۔ گندم چینی، چاول اور بناسپتی گھی کنٹرول ہو گئے۔ کنٹرول بھی نہ تو وقت پر آتا اور نہ پورا ملتا۔ کئی بار دو دو تین تین مہینے تک نہ ملتا۔ ہر آنے والے کنٹرول کا کم از کم آدھا حصہ غیر ممالک میں اسمگل کیا جاتا اور باقی ماندہ آدھے حصے میں سے بیشتر بعد میں گراں فروشی کے لیے چھپا دیا جاتا۔ کنٹرول کی اشیاء کی کمی کے سبب لوگ مہنگے داموں بھی چیزیں خریدنے پر مجبور تھے۔ آخر کھائے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ غریبوں نے نسبتاً امیر لوگوں سے رقم قرض لے کر یا اپنی چیزیں اور جائیدادیں گروی رکھ کر، اپنے اخراجات پورے کیے پھر آہستہ آہستہ دوسری چیزوں کے نرخ بھی پہلے سے بہت بڑھ گئے، اور لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "ہر چیز خدا نے غارت کر دی ہے۔" اب عام اور اوسط درجے کے لوگوں کے لیے اپنے اخراجات پورے کرنا بہت مشکل ہو گیا۔

ان کے علاوہ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ کسی نہ کسی بہانے چندے کے لیے آ رہے تھے۔ ایسا ہفتہ نہیں گزرتا کہ دو تین گروہ چندے کے لیے نہ آتے۔ کبھی کسی مسجد کی تعمیر کے نام

پر، کبھی کسی مدرسے کی تعمیر یا اس کے طلبہ کے اخراجات کے نام پر، کبھی جنگی قیدیوں کے بال بچوں کی امداد کے نام پر، کبھی گم شدہ بچوں کی تلاش کے اخراجات کے نام پر، کبھی سیلاب زدگی کے نام پر، کبھی شادی بیاہ کے نام پر اور کبھی غربت اور کئی دوسری باتوں کے نام پر۔ کئی آنے والے گروہوں اور افراد نے چندے کے شائستہ الفاظ کا استعمال بھی ضروری نہیں سمجھا بلکہ اپنے آپ کو براہ راست بھکاری ظاہر کیا۔ اور پیسے، کپڑے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں مانگیں۔ چندہ اور بھیک کی خاطر ملک کے گوشے گوشے سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی آمد و رفت اور جلد بازی پر یہاں کے لوگ حیران تھے کہ ملک کے دوسرے علاقوں کے وہ لوگ اس علاقے کو نجانے کس قسم کا علاقہ سمجھتے ہیں۔ شاید ان لوگوں کے خیال میں یہاں لوٹ پڑی ہوئی تھی۔

انہی نئے قہر اور مصائب کے سبب اس علاقے میں غربت، تنگ دستی اور بھوک میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ اور یہ شکایت ہر کسی کی زبان پر تھی۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح رئیس آدم بھی معاشی طور پر بدحال ہو گیا۔ اس کی رئیسی کا محض نام رہ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسے اپنے گھریلو اخراجات کے لیے بھی زیادہ تر قرض لینا پڑتا اور اب تک دوسرے لوگوں کے علاوہ سیٹھ شاہو کے دو ہزار روپے کا مقروض تھا۔

ابھی جو اس نے سیٹھ کو دیکھا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں کہ وہ اس سے کچھ اور پیسے قرض لے گا، چند دن اور کاٹنے کا گر۔

"چلیے جناب، چھپر کے نیچے بیٹھتے ہیں" رئیس نے سیٹھ سے کہا اور دونوں ساتھ ساتھ چھپر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں رئیس نے سوچا کہ سیٹھ پہلے کی طرح یقیناً گدھے اور گائے بیل مستعار مانگنے آیا ہوگا۔ میں اپنے گدھے اور گائے بیل اسے مستعار دینے میں کوئی چوں چرا نہیں کروں گا کیونکہ وہ آج میری مشکل دور کرنے آیا ہے

مشکل پر پہنچنے کے سبب وہ رئیس کو زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی لمبی گردن بڑی مونچھوں اور لیاقت کٹ ٹوپی کے ساتھ لالچی اور سود خور دیہاتی سیٹھ کے بجائے سخی اور انصاف پسند بادشاہ لگ رہا تھا۔

چھپر کے نیچے پہنچنے اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد سیٹھ نے آلتی پالتی مار کر کسی لگی پٹی کے بغیر کہا، "میں اپنے پیسوں کے لیے آیا ہوں"

"۔۔۔رئیس یہ بات سنتے ہی جیسے چونک پڑا۔ اسے گمان تک نہ ہوا تھا کہ سیٹھ اس سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرے گا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ فکر میں ڈوب گیا۔ فکر کے دوران اس کے ہاتھ سر کے ریشمی رومال تک گئے۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا ریشمی رومال کھولا اور پھر مضبوط باندھ دیا۔ اس کے یہ فکر کرنے اور رومال کھولنے اور باندھنے کے دوران سیٹھ اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ سیٹھ کے خیال میں چھوٹے قد اور دبلے پتلے جسم کے رئیس کا قد پہلے سے نسبتاً چھوٹا اور جسم پہلے سے نسبتاً دبلا پتلا ہوگیا تھا اور اس کے پہنے ہوئے ملیشیا رنگ کے کپڑے اس کے لیے زیادہ کھلے اور لمبے ہوگئے۔ فکر کی گہرائیوں سے نکلنے کے بعد ایک بار اس نے یہ کہنا چاہا کہ "میں تو آپ سے مزید کچھ پیسے قرض لینا چاہتا تھا" لیکن پھر افسردگی سے اس کی زبان سے نکلا، "پیسے تو نہیں ہے۔"

یہ بات اس نے ایسی کمزور آواز میں کہی جیسے وہ پہلے سے زیادہ معمر اور کمزور ہوگیا ہو۔

"کیا؟" سیٹھ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"اپنی اراضی میرے پاس گروی رکھ دیں۔"

"یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟" رئیس کی سانس رکنے لگی "ابھی بے شک ہم تنگ دست ہیں مگر اراضی گروی ہوگئی تو ہم مر جائیں گے۔"

"تو پھر آپ خود ہی بتائیں، میں کیا کروں؟ میرا کیا قصور ہے؟"

"آپ کو مزید کچھ عرصہ صبر کرنا ہوگا میں اپنے بیٹے کو عربستان بھیجوں گا پھر آپ کے سارے پیسے آپ کو مل جائیں گے۔"

"کس بیٹے کو؟" سیٹھ نے حیرانی سے پوچھا۔

"سب سے بڑے بیٹے باہوت کو" رئیس نے کمزور لہجے میں کہا۔

"اوہو، یہ تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات ہے ورنہ کہاں باہوت اور کہاں عربستان

جبکہ لڑکا تو وہ تو ابھی بچہ ہے۔"

"بچے ہونٹ سے بھی زیادہ چھوٹے قبرستان میں دفن ہیں" کتنے وقوں نے اپنے دل کی تسلی اور سیٹھ کی بات کے جواب میں کہہ دیا مگر کہتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ لڑکا لڑکا ہوتا ہے اور لڑکی اس کا متبادل نہیں کر سکتی۔ اگر اس کی سب سے بڑی اولاد لڑکی کے بجائے لڑکا ہوتی یا کم از کم دوسری بڑی اولاد لڑکی کے بجائے لڑکا ہوتی تو اس کی مصیبتیں کم ہو سکتی تھیں اور موجودہ برے حالات کا بوجھ اتنا زیادہ نہ ہوتا۔

"رئیس، اصل بات یہ ہے کہ میں اب مزید صبر نہیں کر سکتا۔ آپ صرف میرے مقروض نہیں اور بھی کئی لوگوں کے مقروض ہیں۔ اپنی اراضی گروی رکھ دیں۔ آپ کے سارے قرض ادا ہو جائیں گے۔"

رئیس نے سیٹھ کو بغور دیکھا اس کی نگاہیں سیٹھ کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھوں سے پھسل کر اس کے موٹے اور لمبے ہونٹوں پر مرکوز ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سیٹھ کے موٹے اور لمبے ہونٹ پہلے سے بھی زیادہ موٹے اور لمبے ہو گئے ہوں اور سور کے ہونٹوں کی مانند لٹک گئے ہوں۔

رئیس آدم اور سیٹھ شاہو اپنی باتوں میں مصروف تھے کہ تحصیلدار اپنے ایک منشی، پولیس کے دو سپاہیوں، دو تین اسی قسم کے سفید پوشوں اور گاؤں کے معتبر کے ساتھ پہنچ گیا۔ آپس میں مصافحہ کرنے اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد رئیس ان کے لیے چائے کا بندوبست کرنے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رئیس ہم جلدی میں ہیں، چائے شائے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم معتبر کے یہاں چائے شائے پی کر آئے ہیں۔" تحصیلدار نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی پھولی ہوئی توند پر پھیرا اور اپنی اونچی اور کرخت آواز میں اسے چائے کا بندوبست کرنے سے منع کر دیا۔ بات کرتے ہوئے اس کے پھولے ہوئے گال اور زیادہ پھول گئے جس سے اس کی ہیبت ناکی میں اضافہ ہوا۔

"اچھا تو آپ لوگوں کی تشریف آوری کا مقصد؟" رئیس دوبارہ بیٹھ گیا اور اچر دل سے

پوچھ بیٹھے۔ اس سے پہلے کہ خود تحصیلدار کچھ کہتا ایک ادھیڑ قسم کے سفید پوش نے کہا:

"صاحب آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں۔ آپ سے پنجاب اور سندھ سیلاب زدگان کی امداد کے لیے چندہ لینے آئے ہیں۔"

"اچھا تو جناب یہی بات ہے؟" رئیس کی زبان سے نکلا لیکن یہ بات کہتے ہی جیسے اس کا دل ڈوب گیا۔

"ہاں بات یہی ہے۔ ہم جگہ جگہ اور گھر گھر گھوم رہے ہیں اور چندہ کر رہے ہیں۔ حکومت کا حکم ہے۔"

"جناب میں ایک گستاخی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس علاقے کے دائمی طور پر قہر و مصائب زدہ لوگوں کے حالات ان علاقوں کے لوگوں کے حالات سے بہتر ہیں؟"

"ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں صرف حکومت کے احکامات پر عمل کرنا ہے۔" تحصیلدار درشتی سے کہنے لگا۔ "کیا آپ حکومت کے احکامات کو نہیں مانتے؟"

"حکومت کے احکامات مجھے منظور ہیں۔ مگر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس علاقے کے لیے بھی چندہ کیا جائے گا یا نہیں؟"

"ہوں، ہوں، ہوں،" تحصیلدار کے ایک ساتھی نے حبسی آواز اور طنزیہ انداز میں رئیس کا مذاق اڑایا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا" تحصیلدار نے کچھ سوچ کر آہستگی سے جواب دیا پھر اپنی آواز بہت اونچی کر کے کہا، "آپ مجھ سے اس قسم کے سوالات کیوں پوچھتے ہیں؟ کیا آپ کو چندہ نہیں دینا ہے؟"

"کیوں نہیں جناب، مجھے اپنی گنجائش کے مطابق اپنے بھائیوں کی بسر و چشم امداد کرنی ہے، میں یونہی پوچھ رہا تھا" اسی بات کے ساتھ ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گھر کے اندر چلا گیا۔

"باہوٹ کی ماں، وہی سو روپے مجھے دے دیں جو آج صبح آپ کو بطور قرض ملے تھے" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ان روپوں کا آپ کیا کریں گے؟ یہ تو میں نے کنٹرول کی چینی اور گندم خریدنے کے لیے قرض لیے ہیں۔ اب بھی میرے گھر مزید چالیس پچاس روپوں کی ضرورت ہے۔ دیر ہو گئی تو چینی اور گندم ختم ہو جائیں گے" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

"چینی اور گندم کی بات فی الحال رہنے دیں۔ تحصیلدار بہت سے لوگوں کے ساتھ پنجاب اور سندھ کے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے چندہ وصول کرنے آئے ہیں۔ جلدی کریں۔"

اس کی بیوی نے مجبوراً تیس روپوں کی رقم اس کے حوالے کر دی۔ اس نے رقم لی اور جا کر تحصیلدار کے سامنے رکھ دی۔ دس دس کے دو نوٹ تھے۔ تحصیلدار نے اٹھائے اور چپراسی کے سامنے پھینک دیے۔

"یہ ہم بھکاری ہیں، جو آپ ہمیں تیس روپے دے رہے ہیں؟ بکاں، دوشنبہ جیسے کسان اور چھان جیسے کاریگر کھوت والے مزدور سے ہم نے سو سو روپے لیے ہیں۔ آپ سے دو سو روپے سے کم ہرگز نہ لیں گے۔"

"کتنے! دو سو روپے؟" حیرت کے مارے اچانک اس کی زبان سے نکلا۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور تحصیلدار نے کہا:

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم فی کس تین تین ہزار روپے بھی لیتے رہے ہیں اور بعض تحصیلوں میں اس سے بھی زیادہ لے رہے ہیں......"

"تو پھر جناب آپ لوگ یہ سارے پیسے واقعی سندھ اور پنجاب کے سیلاب زدگان کو دیں گے؟" اس نے تحصیلدار سے یہ بات پوچھنے کا ارادہ تو کیا مگر کچھ سوچ کر اس بات کے بجائے یہ کہہ دیا:

"لیکن جناب مجھ جیسے لوگوں کے لیے دو سو روپے بہت زیادہ ہیں۔ میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں۔ میں تو قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں اور اس وقت میرے پاس ان تیس روپوں کے سوا ایک پیسہ بھی نہیں ہے" اسے مجبوراً اپنی صحیح صحیح معاشی حالت بیان کرنا ہی پڑے۔

"مذاق کیوں کرتے ہیں۔ آپ کے پاس دو سو روپے بھی نہیں ہوں گے؟" تحصیلدار کو

یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جی نہیں دو سو روپے میرے پاس کہاں سے آئیں گے؟ ہمارا سارا سرمایہ تو محض کھجور کے چند درخت ہیں جن کی فصل اس سال برسات کی نذر ہو چکی ہے۔ کوئی اور خاص فصل تو ہمارے علاقے میں ہوتی ہی نہیں اور جو تھوڑی بہت فصلیں ہوتی ہیں وہ ابھی تک کھڑی ہیں۔ پھر بھلا پیسے کہاں سے آئیں گے؟"

"یہ سب کچھ جاننا آپ کا اپنا کام ہے۔ ہم تو بس آپ سے دو سو روپے مانگتے ہیں" تحصیلدار نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا "جب تک آپ اتنے پیسے نہیں دیں گے، ہم یہاں سے نہیں اٹھیں گے"

رئیس نے تحصیلدار کی طرف دیکھا، اس کے ساتھ آنے ہوئے اپنے گاؤں کے معتبر کی طرف دیکھا، انگریز قسم کے سفید پوشوں کی طرف دیکھا، لیویز کے سپاہیوں کی طرف دیکھا، ان کے اسلحہ اور سامان کی طرف دیکھا اور پھر خیالات میں کھو گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ صاحب اور اس کے ساتھی اور پشت پناہ خوفناک ہیں جو کچھ بھی کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ نجانے کتنے لوگوں پر کیا کیا مظالم ڈھاتے رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پیسے نہ دینے کے باعث مجھ سے بھی اسی قسم کا سلوک کریں۔ میں اس قسم کی باتوں سے نہیں ڈرتا مگر میرے بال بچوں کو تکلیف ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ بے عزتی بھی ہوگی اس لیے جس طرح بھی ہو، مجھے دو سو روپے دینے چاہئیں۔

اب اس بات کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں اپنی اراضی سیٹھ شاہو کے پاس گروی رکھ دوں۔ سیٹھ کے قرضوں سے بھی نجات مل گئی اور جو پیسے رہ جائیں گے وہ کچھ عرصے کے اخراجات کے لیے بھی کافی ہوں گے اس وقت تک شاید بابوٹ عربستان چلا جائے اور پیسے کما کر بھیج دے۔

اس حد تک سوچتے رہنے کے بعد، یوں لگا جیسے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہو تب اس نے اطمینان سے اپنی توجہ سیٹھ کی جانب مبذول کی اور کہا:

"سیٹھ صاحب میری طرف سے تحصیلدار صاحب کو دو سو روپے دے دیں پھر بعد میں

حساب کتاب کریں گے.....''

''لیکن میری بات پھر وہی ہے''

''خیر، مجھے قبول ہے.....''

تحصیلدار کو مطمئن کرنے کے بعد، رحیم نے اپنی اراضی سیٹھ کے پاس چھ ہزار روپے میں گروی رکھ دی۔ تحصیلدار کو دیتے ہوئے دو سو روپوں کے ساتھ دو ہزار دو سو روپے اس نے سیٹھ سے وصول کر لیے اور رہن نامہ اور رسید لکھوا کر اس کے حوالے کر دیے۔

سیٹھ کے جانے کے بعد جب رحیم کے دوسرے قرض خواہوں کو خبر ہوئی کہ رحیم نے اپنی اراضی چھ ہزار روپے میں گروی رکھ دی ہے تو وہ بھی اس کے پاس پہنچ گئے اور اپنے قرضوں کا تقاضہ کرنے لگے۔ رحیم نے ان سے مہلت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ ان سب کا کہنا تھا کہ موجودہ خراب حالات نے انہیں بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ وہ اتنے بدحال ہو چکے ہیں کہ اگر انہیں اپنے قرضے نہ ملے تو چند ہی دنوں میں یا تو وہ اور ان کے بال بچے بھوکے مر جائیں گے یا پھر انہیں بھی اپنی اراضیات گروی رکھنی یا بیچنی پڑیں گی، جس پر رحیم کو مجبوراً ان کے قرضے ادا کرنے پڑے۔

تمام قرضے چکانے کے بعد رحیم آدم کے پاس صرف چالیس روپے رہ گئے تھے جو دس دس کے چار نوٹ تھے۔ دس دس کے یہ چاروں نوٹ اس نے بار بار گنے کہ شاید گننے میں غلطی ہوئی ہو اور پیسے حقیقت میں زیادہ ہوں لیکن بار بار گننے کے باوجود، چالیس روپوں کے وہی دس دس کے چار نوٹ ہی نکلے۔

''دس دس کے صرف چار نوٹ ...'' وہ بڑبڑانے لگا، ''دس ... دس کے ... صرف چار نوٹ ... صرف چالیس روپے ... صرف ... چالیس ... روپے ... دس ... دس کے ... صرف ... چار ... نوٹ''

وفور رنج و محن سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہ جا کر ایک چارپائی پر دھڑام سے پڑا۔

صورت خان مری

قتل رحم دلی

۴۰×۲۰ کے ہال میں ایئر کنڈیشنر کے باوجود ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ باہر گرمی کم ہے، حالانکہ ہال میں پندرہ بیس سے زیادہ لوگ بھی نہ تھے۔ کمرے کے باہر برآمدے میں تین چار نوجوان ٹیپ لگے مہمانوں کے لیے ریفریشمنٹ کے بندوبست میں مصروف تھے۔ میں نے یہ مناسب جانا کہ برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب بیٹھ جاؤں تاکہ امدادی سامان سے لدی پک اپ پر نظر رکھ سکوں جسے کلب کے افتتاح کے بعد ات صاحب نے رسمی طور پر روانہ کرنا تھا۔ مجھے امدادی سامان کی تفصیل کے بارے میں بریفنگ دینی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ موقع ملتے ہی امدادی اشیاء کی تفصیل پر ایک نظر ڈالوں۔ جونہی صدر کلب افتتاحی اور خوش آمدیدی کلمات کے لیے اٹھے میں نے موقع غنیمت جانا اور امدادی سامان کی فہرست پر نظر ڈالی۔

۵۰ کمبل، ۷۰ رضائیاں، ۱۰۰ جوڑے موزے، اتنے ہی بنیان اور نیکر، میکڈونلڈ کے ۲۰۰ پیکٹ برگر جو ادارے نے براہ راست عطیہ کے طور پر دیے تھے، دس بنڈل ڈنمارک سے تیار کردہ پنیر جو سفارت خانے نے دیے، پکے پکائے کھانے کے ۲۷۶ ڈبے، ایک بڑے تھیلے میں

ڈبل روٹیاں

تالیوں کی آواز سے میں اسٹیج کی جانب متوجہ ہوا۔ صدر کلب آزادیٔ تحریر و تقریر اور
پریس کے بارے میں کہہ رہے تھے اور ان صاحب میز پر پڑے مقامی اخبارات الٹ پلٹ کر
دیکھ رہے تھے جن کے صفحہ اول پر ان کی رنگین تصویر پورے صفحہ پر چھپی ہوئی تھی۔ وہ کافی
شاش بشاش نظر آ رہے تھے اور پر جوش انداز میں انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا۔

"ہم اس پر یقین رکھتے ہیں۔ گزشتہ حکمرانوں کے کھانے کے اور کھانے '

میری نظر فوراً امدادی سامان کی فہرست پر پڑی کے چار کنٹینروں کے ۱۷۶ ڈبے، ایک
بڑا تھیلا ڈبل روٹیوں کا بسکٹوں کے ۵۰۰ پیکٹ، ۹۶۳ منرل واٹر کی بوتلیں جو برٹش ایمبیسی نے
دی تھیں، مختلف ادویات کے دس کریٹ آنکھوں کے سامنے جنگ عظیم اول کے بعد کے
سالوں کا منظر گھوم رہا تھا جب جنگ عظیم اور بلوچستان میں بھوک اور شورش کے بعد نامعلوم
بیماریاں پھیلی تھیں جسے مقامی زبان میں ڈ ن کہتے تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں مال مویشی اور
لوگ بے گور و کفن مرتے رہے لیکن بیماری کی تشخیص نہ ہو سکی۔ عام افواہ یہ تھی کہ بارودی اثرات
سے بیماری پھیلی حیرانی کی بات ہے بلوچ ہوپ کے بیماروں کو تنہا الگ تھلگ رکھتے ہیں اور
خیموں کو اس طرح سے بند کرتے ہیں کہ ہوا تک کا گزر نہ ہو۔ ہفتہ دس دن قبل سڑک سے آٹھ
دس میل کے فاصلے پر امدادی کیمپ تھا اور میں اپنے ڈرائیور کے ہمراہ یونہی آگے پیچھے میں نکل
پڑا۔ مزید تیس چالیس میل ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد، تاریکی پھیلنے پر ہم نے گاڑی کی بتیاں روشن
کیں تو کچھ خیمے دور دور تک بکھرے نظر آئے۔ ہم نے ہارن بجائے تاکہ کوئی ہماری طرف
آئے۔ جب کوئی ردعمل نظر نہ آیا تو پیدل خیموں کی طرف چل پڑے کہ اچانک پتھروں اور
کھائیوں کے اندر سے کوئی چلتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ خیموں کی طرف جانے سے منع کرنے لگے
۔ گاڑی کی روشنی میں ادھر ادھر سے مرے ہوئے جانور اور کہیں کہیں مردہ جانوروں پر کتوں کو
جھپٹتے، دور دور گیدڑ، لومڑیوں کی آوازیں یا کبھی کبھار دور ہی سے گڑگڑ کی غراہٹ سنائی دیتی
تھی۔ ہم سمجھے کہ شاید تعفن اور بدبو کی وجہ سے وہ ہمیں جانے نہیں دے رہے۔ گاڑی کی بتیاں

بجھا کر ہم نے ٹارچ روشن کیا اور انہیں بتایا کہ ہم ڈاکٹر ہیں، پیچھے امدادی کیمپ ہے، یونہی نکل آئے کہ کسی آبادی میں اپنی آنکھوں سے بیماروں کو دیکھیں، ممکن ہے کوئی علاج کر سکیں۔ تمام موجود لوگوں نے متفقہ طور پر ہمیں خیموں کی طرف جانے سے منع کیا کہ وہاں خیموں میں صرف ہوپ اور بیمار رہ گئے ہیں۔ صبح و شام کمبل یا چادر ڈھانپ کر کوئی شخص وہاں جاتا ہے اور دور سے آواز لگاتا ہے تاکہ زندگی کے آثار کا پتہ چل سکے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز ہو تو خیمے کے اندر رکھ دیتے ہیں۔ یہ آفت زدہ بیمار جب تک اٹھنے چلنے کی طاقت رکھتا ہے یا کوئی پیارا ماں باپ بھائی بیٹا بیٹی، جس کو زندگی پیاری نہیں، وہ ان مریضوں کی وقتاً فوقتاً تیمارداری کے لیے خیموں میں چلا جاتا ہے۔ وہ لوگ بتا رہے تھے کہ ہم نے کسی مریض، آفت زدہ کو بچتے نہیں دیکھا۔ ہم مریضوں کو ضرور دیکھیں گے۔ پہلے ہی خیمہ کا تعفن جان لیوا تھا۔ تین ڈھانچے زندگی اور موت کے سامنے گرمی، حبس، پسینہ اور بند خیمے میں ہوا کے بغیر دم گھوٹے پڑے تھے۔ جو شخص ساتھ تھا اس نے بتایا کہ ماں باپ اور بیٹی ہیں۔ بیٹی سترہ اٹھارہ سال کی ہے۔ ماں ڈیڑھ سال قبل بھیڑ بکریاں چراتے چٹان سے گری۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے یا کسی چوٹ لگنے سے چلنے پھرنے سے معذور ہے کہ ہوپ اور آفت نے آ گھیرا۔ بیچاری خیمہ میں ہی پڑی رہتی تھی۔ ہوپ اور آفت سے کہیں چھپ بھی نہیں سکتی تھی۔ لاچار جو ہے۔ ماں باپ ہیں، بیٹی کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ آخر انہیں بھی آفت لگ گئی اور یہ حالت ہوگئی۔ ٹارچ کی روشنی میں صرف تینوں کی آنکھوں کی پتلیاں آہستہ بہت ہی مشکل سے ہلتی محسوس ہو رہی تھیں، جیسے کوئی زندگی سے بھی پیاری، انمول چیز ڈھونڈ رہی ہوں جو ماں کی ممتا بھی نہیں، پدر مہربان کی نگاہ بھی نہیں، نہ ہی بیٹی کی عصمت کا سایہ۔ ہم نے خیمہ میں ادھر ادھر ٹارچ کی روشنی گھمائی دروازے کے اندر کی طرف دو برتنوں میں سے ایک میں گدلا گدلا تھوڑا سا پانی، دوسرے میں باریک باریک روٹیوں کے ٹکڑے شاید لسی یا دودھ میں بھگو کر کوئی رکھ گیا۔ دوبارہ روشنی ادھر ڈالی تو باپ کی نظریں بیٹی پر جمی تھیں۔ روشنی گھمانا چاہتے تھے کہ اپنے کو بال میں جھنجھوڑتے محسوس کیا۔

’’مرامر‘‘

ایک پرزہ کاغذ کا آنکھوں کے سامنے تھا۔ مینڈ منڈ سے وہ پرچہ ایک دبیز، آٹھ دس
بہت سے ڈبے اتنا ہی پڑھ سکے کہ صدر کلب کی آواز ابھرتی محسوس ہوئی "اپنے آدمی کو
نہیں جلدی نکال دے، فنکشن ختم ہونے کو ہے۔ مہمانوں کے لیے رفرشمنٹ تیار ہے۔"

مزید پڑھے بغیر چپ چاپ ساتھ بیٹھے اپنے ساتھی ڈرائیور کو دی اور خود لاشعوری طور پہ
امدادی سامان کی فہرست پڑھنے لگے۔

"دواؤں کے ڈبے کیا قیمت ہوگی ان دواؤں کی دوائیں کتنی مہنگی ہیں۔
جیسے نمش کا ایک ٹیکہ چھ سات سو روپے کا، تھن کے لیے اتنے سو روپے۔ موت کا ٹیکہ، موت
آرام سے آئے، بغیر درد کے نیند میں، سانس گھٹنا نہ محسوس ہو، بچی نہیں سترہ سال کی بھر جوانی
تو باپ؟ ماں تو مر کا آنچل نہیں نہیں ذرا ایک منٹ گاڑی میں کوئی دوا، کھانے کی کوئی چیز
دیکھتے ہیں تینوں جلدی میں نکلے اور گاڑی سے چند دوا، کھانے کے پیکٹ جو ساتھ تھے لیے
واپس خیمے کے نزدیک پہنچے اور خیمے کے دروازے کی طرف روشنی ڈالی تو ایک کتا کبھی ہونٹ
چاٹتا، کبھی زبان نکال کر سانسیں بھرتا کم بخت، ہم نے جلدی میں کیا کیا، ذرا دیر کے لیے
دروازہ کھلا چھوڑا۔ کھا گیا غریبوں کا کھانا اس کا منہ مردہ جانوروں کا گوشت چاٹ چاٹ کر
کتنا سرخ ہوگیا ہے کہ باہر نکلی زبان بھی چپکی لگتی ہے میرے کانوں میں ایک گونج دوسری
گونج میں ملی۔ ایک زوردار آواز سنائی دی جیسے کوئی وزنی چیز گری ہو، یا اس صاحب نے تقریر
کے دوران ڈائس پر ہاتھ مارا ہو

"پریس آزاد ہے، تقریر کی آزادی ہے، ریاست کی طرف، دور وطن پر اٹھنے والی ہر
آنکھ پھوڑ دی جائے گی زبانیں نکال لیں گے، گردنیں کھینچ لی جائیں گی۔"

پروفیسر صبا دشتیاری

کہاں سے آئے ہو؟

کراچی میں لیاقت میموریل لائبریری کو سب سے بڑی لائبریری کہا جاتا ہے۔ میں جب اپنے گھر میں بچوں کے شور شرابے سے تنگ ہوا تو اپنی پڑھائی لکھائی کا سامان لیے لائبریری کی طرف چل دیا۔

یہ لائبریری لمبائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ لمبا ہونے کے علاوہ اس میں حد سے زیادہ کتابیں بھی ہیں لیکن کھاتے پیتے گھروں کے نوجوان اپنی مرسڈیز گاڑیوں سے اتر کر لائبریری کے "ریڈنگ ہال" کی میز پر اپنی تمام کتابیں رکھ دیتے۔ لیکن ہر ایک ان کی نفسیاتی کمزوریوں کو جانتا ہے۔ اسی طرح جب جب موقع ملے تو دو تین ٹوٹے پھوٹے انگریزی کے الفاظ خوش الحانی سے ادا کر دیتے تاکہ سب سمجھ جائیں یہ اتنے قابل ہیں۔

آج جب میں لائبریری میں پہنچا تو ریڈنگ ہال بالکل خالی تھا۔ اس لیے کہ کرکٹ کا میچ چل رہا تھا۔ اس علاقے کی سب سے بڑی بیماری کرکٹ ہے۔ خیر! میں نے اپنی پڑھائی کا سارا مواد ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور کتابیں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ صبح سے بیٹھا تھا لیکن کام اتنے زیادہ تھے کہ جب میں نے کتابوں کو بند کیا اور لائبریری کے وال کلاک کی طرف نظریں دوڑائیں تو

معلوم ہوا کہ چھ بجے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ دن تاریکی کی طرف جا رہا تھا۔

اتنا بیٹھنے سے میں تھک گیا۔ اتنا پڑھنے اور لکھنے سے میں بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ کتابوں اور منتشر کاغذوں واپس کیا۔ سارے مواد کو بیگ میں ڈالا۔ اور لائبریری سے باہر نکل گیا۔ آسمان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گرد و نواح میں خوبصورت اور جدید طرز کے مکانوں کی روشنیاں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وسیع و عریض سڑک کی دونوں جانب بڑے بڑے برقی بلب روشن تھے۔ سڑک پر تمام چھوٹی موٹی چیزیں اچھی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ بہت سی گاڑیاں سانپ کی طرح رینگ رہی تھیں۔ مکانوں میں رہنے والے لوگ تمام دن گھروں میں چھپنے کے بعد باہر نکل رہے تھے۔ گاڑیاں ڈرائیو کرتے ہوئے اور ہنستی ہوئی پیدل لوگوں کی سائیڈ سے ہوا کی طرح گزر گئیں۔

میں خوشی خوشی بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میں نے اپنے پیچھے ایک کتے کی دردناک آواز سنی۔ اسی وقت چند خوش رنگ و خوش پوش نوجوان اپنی قیمتی گاڑی میں سوار میرے سامنے سے تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے گزر گئے۔ اسی وقت میری نظر کتے پر پڑی۔ کتا پیچھے کی طرف سے بالکل کچل گیا تھا اور سڑک پر تڑپ رہا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ کئی کتے آگئے اور گرتے ہوئے کتے کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا کہ لوگ اس واقعہ کے حوالے سے کس طرح کا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ سڑک پر گاڑیوں کا آنا جانا بالکل پہلے کی طرح تھا۔ اور پیدل چلنے والے لوگ بھی خوشی خوشی جا رہے تھے۔ لیکن کتوں کا ایک گروہ پریشان اور جذبات میں تھا۔ وہ سب اس تڑپتے گرتے ہوئے کتے کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔

وہ گاڑیوں کے آنے جانے سے بے قرار ہو کر سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔ اب میں نے دیکھا کہ گرتا ہوا کتا ہمت کر کے روڈ سے باہر نکل گیا۔ وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے ایک آدھ سانس لی۔ یہ اس کی آخری سانسیں تھیں۔

میں یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک بس آ کر میرے سامنے رک گئی۔ بس کا کنڈیکٹر شور مچا رہا تھا، ”سیاری   سیاری“ میں بے چینی سے بس میں سوار ہو گیا۔

کراچی میں جب رات شروع ہوتی ہے تو تاریکی بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور روشنی زیادہ بڑھتی رہتی ہے۔

راستے بھر میں اسی روشنی کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا پر میرے خیالوں کا بیڑا اس جگہ غرقاب ہو گیا۔ جہاں میں نے دیکھا کہ تاریکی زیادہ ہو رہی ہے، مجھے محسوس ہوا کہ بس اب لیاری میں داخل ہو گئی ہے۔

چین کے خواب دیکھنے والے لیاری کے روشن دل عوام کے گلی کوچوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہیروئن پینے والے تڑپ رہے تھے۔ ہر جگہ تاریکی راج کر رہی تھی۔ جب میری گلی کا اسٹاپ آ گیا تو میں فوراً بس سے اتر گیا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ ناکوشمبک بھی ابھی مزدوری سے آیا ہے اور اپنے گدھے کو گاڑی سے کھول کر چارہ ڈال رہا تھا۔

گدھے کے باڑے میں ایک کالا کتا گدھے کے سامنے سویا ہوا تھا۔ ناکوشمبک نے ایک آواز سے کتے کو خواب سے جگا دیا۔ کتے نے اپنی دم ہلاتے ہوئے ناکوشمبک کی طرف دیکھا۔

پھر میں نے دیکھا کہ ناکوشمبک نے اپنی جیب سے کچھ بسکٹ نکالے اور بائیں ہاتھ سے کتے کی طرف بڑھائے۔ کتے نے خوشی سے بسکٹ اپنے منھ میں ڈالا اور خوش خوش کھانا شروع کر دیا۔

منیر بادینی

اور پھر گیٹ کھلا

سول سیکرٹریٹ کے گیٹ پر گارڈ نے انور کی گاڑی روک لی۔ انور نے سر باہر نکال کر رکتے ہوئے بوڑھے گارڈ سے پوچھا آج کیا ہوا؟ گارڈ نے چہرے کو تاؤ دیتے کہا کہ آج حکم ہی ایسا ہے۔ صاحب باقی دو گارڈ بھی گاڑیوں کو روک کر انہیں واپس جانے کا کہہ رہے تھے۔ انور نے اپنے طور پر سامنے والے گارڈ کی بات کو درست قرار دیا اور پیچھے راستہ بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ گھمایا اور گاڑی لٹن روڈ کے بالائی حصے کی جانب موڑ دی۔

انور جان گیا تھا کہ گارڈز سول سیکرٹریٹ میں گاڑیوں کو جانے سے روک رہے ہیں۔ کل کا واقعہ جو شہر میں ہوا تھا، یہ سب اس کے ثمرات تھے۔ وہی پرانی بات، دو قبائل آپس میں الجھ گئے تھے جس میں دس افراد قتل ہوئے اس واقعے نے پورے شہر کے حسن کو اداسی اور خوف کی چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اگلے لمحے کس سڑک کس چوک اور کس گلی میں دو قبائل کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک بار پھر راہ چلتے افراد ان کا نشانہ بن جائیں۔ اس خوف اور عدم تحفظ کی وجہ سے لوگ اپنے کاروبار، مزدوریوں اور سودا سلف کی خریداری کے دوران احتیاط برت رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ قبائل کے درمیان جنگ کیوں ہو رہی ہے حالانکہ انتظامیہ

نے چاروں طرف لوگوں کی حفاظت کے لیے ملیشیا اور پولیس کے دستے کھڑے کر رکھے تھے
۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ خوف و ہراس بڑھتا جا رہا تھا۔ سول سیکرٹریٹ کا گیٹ آج اسی لیے
بند تھا۔ جس گاڑی پر اسٹیکر لگے ہوتے اسے اندر جانے کی اجازت ہوتی۔ بغیر اسٹیکر کسی بھی
گاڑی کو اندر لے جانے کی قطعی ممانعت تھی۔

انور کی گاڑی پر اسٹیکر نہیں لگا ہوا تھا۔ اگر اسے اندر جانے کی اجازت ملتی تو ممکن ہے وہ
سیکرٹری ایس اینڈ جی اے ڈی سے، جو اسٹیکر دینے کے مجاز ہیں، اپنے لیے اسٹیکر حاصل کرتا مگر
گارڈز کی سختی کی وجہ سے وہ اندر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سیکرٹریٹ کا ملازم تھا نہ اسے وہاں کوئی کام تھا
لیکن وہ روزانہ سیکرٹریٹ ضرور جاتا کیونکہ اسے وہاں جانا ہی تھا، بس یونہی کبھی ایک وزیر یا
سیکرٹری کے دفتر تو کبھی دوسرے سیکرٹری یا وزیر کے دفتر۔ کوئی بھی خالی نشست دیکھ کر وہاں بیٹھ
جانا اس کا معمول تھا۔ کبھی کبھار وہ وزیروں کے بلاک کے سامنے سبزہ زار پر اپنے دوستوں کے
ہمراہ گپ شپ کرتے ہوئے اور وقت گزارتے ہوئے نظر آیا۔ سارے وزیر اور تمام سیکرٹریز اس کے
واقف تھے۔ اکثر ضرورت مند لوگ اسے وزیر اور سیکرٹریوں کے پاس سفارش کے لیے لے
جاتے حالانکہ اسے سفارش سے نفرت تھی۔

انور کون تھا، مستقبل کا وزیر آنے والے دنوں کا سینیٹر یا مستقبل کے حوالے سے سیاسی
رہنمائی کرنے والا عظیم انسان؟ انور ایک آدمی تھا، عام انسان۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نے
کچھ خواب دیکھے تھے، اس کی کچھ خواہشیں تھیں۔ وہ شہرت کی طلب رکھتا تھا۔ اسے نان جویں
کے ساتھ طاقت کی بھی طلب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خوابوں کی تعبیر اور اس کی خواہش کی
تکمیل کا نقطہ آغاز سول سیکرٹریٹ ہی ہے۔ اسی وجہ سے وہ روزانہ سیکرٹریٹ آتا اور مختلف
زاویوں سے شہرت، روزی اور طاقت کو اپنانے اور مقامات کے تعین کے بارے میں سوچتا۔

اس کی چند دکانیں تھیں۔ دکانوں کو کرائے پر دے کر اپنا گزارہ کر رہا تھا۔ سول سیکرٹریٹ
کی بڑی بڑی دیواروں سے بہت دور اور فاصلے پر اس کی تھوڑی سی بنجر زمین تھی۔ اس کی ایک
گاڑی تھی۔ اس کا ایک قبیلے سے بھی تعلق تھا۔ اس نے میٹرک گرامر سکول سے پاس کیا تھا۔ ایک

زمانے میں وہ انڈین فلموں کا ہیرو بننے کی خواہش رکھتا تھا لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پھر اس نے اپنی بنجر زمینوں کی بنیاد پر زرعی بینک سے قرض لیا اور اپنے لیے چھاؤنی میں ایک بنگلہ بنوالیا، پھر ایک گاڑی خرید لی۔

۱۹۷۰ء میں قوم پرست سیاست کے حوالے سے اس نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے صوبائی اسمبلی کی سیٹ مل جائے لیکن انڈین فلموں کا ہیرو بننے کی خواہش کی طرح یہ خواہش بھی ادھوری رہ گئی اور اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ ۱۹۷۰ء کے سیاسی دور میں قبائلی سرداروں کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ اس کی تمام تر نیک نیتی اور قومی جذبے کے باوجود اسے کوئی مقام نہ مل سکا صوبائی اسمبلی کی سیٹ کی بات اپنی جگہ اس صورتحال نے اسے ناامیدی کے پاتال میں دھکیل دیا۔ اس نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے قومی سیاست سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔

دوستوں کے ساتھ مل کر ۱۹۷۰ء کی سیاست کو قبائلی مفاد پرستی کا نام دیا اور ڈسٹرکٹ کونسل کا چیئرمین بن گیا۔ لوگ حیران تھے کہ کہاں وہ انور جس نے "وریا" جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس وقت صوبے کی پہلی اسمبلی کو مرکزی حکومت نے توڑا تو صوبے میں بغاوت کی فضا بن گئی تھی لیکن کہاں وہ انور جو چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل تھا اور وہ بھی فوجی ڈکٹیٹر شپ کے دور میں!

تب انور سول سیکرٹریٹ کے نزدیک تر ہوتا گیا۔ ابتداء میں اسے حجابت محسوس ہوئی لیکن جب اس نے اردگرد نظر دوڑائی تو اسے محسوس ہوا کہ یہاں کتنی ہی نامور ہستیاں آتی جاتی ہیں تب وہ خود کو سول سیکرٹریٹ آنے جانے سے نہیں روک سکا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سول سیکرٹریٹ آنے جانے کو فخریہ انداز میں بلاجھجک بیان کرتا بالکل اس شرابی کی طرح جو ابتداء میں ساقی خانے میں آتے جاتے پینے والوں سے کتراتا ہے اور ہمہ گیر کیف میں مبتلا ہوکر سب کو ایک طرح کا تصور کرتا ہے۔ اس کے اندر نیشنلزم کا جذبہ، مذہبی جذبہ، سیاسی جذبہ اور اس طرح کے سارے جذبات مل کر اس طرح ایک ہوجاتے ہیں کہ ان میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

حالانکہ انور کے ہاں بھی ان جذبوں کی ہڑیں دم توڑ چکی تھیں۔لیکن شہرت، نام جویں اور طاقت کے حصول کا جذبہ آج بھی جوان تھا۔ جب نیشنلسٹ سیاست اور قبائلی سیاست ناکام ہوئی تو بڑی آدمی کی تعریف اس کے ہاں یہ تھی کہ سارے جذبے بے کار ہیں سوائے ان تین جذبوں کے وہ اب خود کو ملامت کرنے لگا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اسے یہ خیال کیوں آیا کہ انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے،اصل چیز نام، روٹی اور طاقت ہے۔ اب وہ ان خواہشات کو سول سیکرٹریٹ کی مضبوط دیواروں میں اٹل بنانا چاہتا تھا۔

الیکشن قریب آرہے تھے۔اب اسے صوبائی اسمبلی کی سیٹ لازماً حاصل کرنی تھی۔پچھلی مرتبہ سرداروں کی مضبوط گرفت کے باعث وہ حالات کو نہیں سمجھ سکا تھا اور اس کے خواب چکنا چور ہوگئے تھے۔لیکن اب ۱۹۷۰ء کا دور نہیں، یہ ۱۹۹۰ء ہے۔اب حالات میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔اب انور اس بات کو محسوس کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ پرانے نظام بوسیدہ ہوگئے ہیں جن میں عام آدمی کی شرکت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

گزشتہ دنوں کی قبائلی چپقلش نے انور کو شدید صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ اب جبکہ وہ گورنر ہاؤس اور نیلی گراف آفس کے چوراہے پر تھا تو اسے خیال آیا کہ وہ نظام دوبارہ زندہ ہو رہا ہے یا وہ نظام اپنی موت آپ مرنے کے قریب ہے یا کوئی انہیں اس طرح تباہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ آپس میں لڑیں اور تباہ ہوجائیں؟ اور صورتحال پیدا ہوئی تو میں اسمبلی سیکرٹریٹ کی سیٹ حاصل کر لوں گا مجھے بڑا نام ملے گا اور پھر میرے لیے بھی اسلام آباد میں بنگلہ تیار ہو سکے گا۔

اب وہ گرامر اسکول سے گزر کر چھاؤنی کی کشادہ اور پرسکون سڑکوں پر گاڑی دوڑانے لگا۔اچھا ہوا آج اسے سول سیکرٹریٹ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی پہلی بار اسے موقع ملا تھا کہ وہ خود کو چیزوں کی ترتیب میں دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔ اب چیزوں کی ترتیب میں خود کو دیکھنے کی بات اس کے دماغ میں یوں سمائی تھی جیسے صوبائی اسمبلی کا ممبر بننے کی خواہش یہ بات پہلی بار اس کے ذہن میں اس وقت آئی جب اس نے محسوس کیا تھا کہ غیر مہذب افراد اجتماعی فکر میں خود کو تباہ کر لیتے ہیں اور مہذب افراد اپنی انفرادیت چاہتے ہیں اور

یہی فرق وحشی جاہل اور مہذب افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کے بھی خیال میں شہرت، نام جوئی اور طاقت کا تصور اس کے دل و دماغ میں موجود تھا لیکن اسے اس نے بہت بعد میں محسوس کیا۔ اپنے گزشتہ دور کو جسے اس نے سرداروں کے قدموں کے نشانوں پر اندھوں کی طرح چلتے ہوئے گزارا تھا اس پر شرمندہ تھا لیکن اب وہ انفرادیت پسندی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے خیال میں اس کی ذات کے علاوہ کوئی چیز اپنی ہستی نہیں رکھتی تھی۔

چھاؤنی میں چلتن مارکیٹ سے اس نے سگریٹ خریدا اور بڑی شان سے گاڑی میں سوار ہو کر واپس آنے لگا۔ آج وہ اپنی گاڑی میں یونہی چلتے رہنا چاہتا تھا۔ بیک ویو میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت پسندی پر مسکرانے لگا۔ کیا فرق پڑا اگر میں انفرادیت پسند ہوں۔ وہ قبیلے جو آپس میں الجھے ہوئے ہیں وہ بھی تو کسی جذبے میں زندہ ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی ایک جذبے میں زندگی گزارنا چاہتے ہوں اپنے لیے کچھ چاہتے ہوں۔ یہ جو قبیلے لڑ رہے ہیں یہ اپنی اپنی خاطر نہیں لڑ رہے۔ میرے غیر محفوظ ہونے نے مجھے انفرادیت پسند بنا دیا ہے اور ان کی جنگ بھی غیر محفوظ ہونے کے احساس کی جنگ ہے۔ جب وہ خود کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں تو ایک دوسرے کی طاقت کو مارنا چاہتے ہیں۔ اس طرح میں بھی اپنے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنا چاہتا ہوں تاکہ میری راہ متعین ہو۔ ہر شخص کسی نہ کسی جذبے میں زندہ رہتا ہے، پھر میں کیوں نصیحتوں کا کشکول لیے پھروں کہ بھائیو! آپس میں خصومت یہ دراصل میں اپنا نقصان ہے بھائیو! اجتماعی فکر کے پھیلاؤ میں آؤ بھائی یہ کرو بھائی وہ کرو   کیوں؟ میں کون ہوں جو لوگوں کو نصیحت کرتا پھروں۔ یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ ہر شخص کسی نہ کسی جذبے میں روز و شب گزار رہا ہے تو رہنے دو جو جہاں خوش ہے خوش رہے، ویسے بھی دنیا تو چلتی ہی رہے گی اور نصیحت اپنے جذبے کی تسکین کے سوا کیا ہے۔

انور ایک بار پھر سول سیکرٹریٹ کی طرف آ رہا تھا جیسے کوئی مقناطیسی قوت اسے سیکرٹریٹ کی جانب لیے جا رہی ہو۔ ایک مرتبہ پھر وہ سول سیکرٹریٹ کے گیٹ کے سامنے پہنچا تو اس مرتبہ اسے دیکھتے ہی گارڈ نے گیٹ کھول دیا جیسے اب کسی کو اس کے بارے میں تشویش نہیں تھی کسی کو

اس پہ شک نہیں تھا۔وہ بڑی تسلی سے اندر داخل ہوا۔اب اس نے اپنے ذہن کے پردے پر ایک منظر ابھرتا ہوا محسوس کیا۔گیٹ اس کے سامنے کھل رہا ہے۔ایک گیٹ کھلنے کے بعد دوسرا گیٹ کھل رہا ہے اب وہ اندر داخل ہوا اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔یہ گیٹ ازل سے یونہی کھلتے جا رہے ہیں جیسے یہاں دو قیمیوں کی لڑائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

انور نے سوچا اور مسکراتے ہوئے سول سیکرٹریٹ کی بلڈنگ میں اپنی کار پارکنگ کی طرف موڑ لی۔

ڈاکٹر علی دوست بلوچ

تاریک راہیں

وہ آج پھر بلیک بورڈ کے سامنے کھڑا تھا۔ ماسٹر کریم بخش کلاس میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے عجیب و غریب تجریدی آرٹ کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنے انداز میں نامکمل تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے اپنے طلبا ساتھیوں کو اپنی تخلیق کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ''پچھلی تصویر تو سب نے پہچان لی تھی، اب بتائیں یہ کس کی تصویر ہے؟'' طلباء سے باتیں کرتے ہوئے وہ بلیک بورڈ کی جانب دیکھ رہا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماسٹر صاحب آگئے ہیں۔

''تو ساتھیو، بتائیں یہ کس کی تصویر ہے؟''

کلاس میں بیٹھے لڑکے کوئی جواب نہیں دے رہے تھے، شاہو سوچنے لگا کہ شاید انہیں تصویر پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا، ''تم لوگ اپنے استاد کو نہیں پہچانتے!''

لڑکے اس کے باوجود خاموش تھے۔ شاہو نے بالآخر ان کی طرف دیکھا۔ کریم بخش کھڑے ہوئے شاہو کی حرکتیں نوٹ کر رہے تھے۔ شاہو نے خجالت اور شرمندگی محسوس کرنے کے بجائے قہقہہ لگاتے ہوئے طلبا سے کہا، ''اب میں سمجھا کہ تم لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا،

ویسے بھی ماسٹر صاحب بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کبھی سزا بھی نہیں دی۔ ان کی تو مثال منہ مشکل ہے۔"

یہ کہتے ہوئے شاہو پچھلی ڈیسک پر جا کر بیٹھ گیا۔

ماسٹر کریم بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شاہو کی بدتمیزی کا کیا جواب دے اور کس طرح پیش آئیں وہ یہ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ چونکہ وہ سزا اور ڈانٹ کے قائل نہیں تھے، اس لیے طلباء کو اپنے عمل اور اپنی گفتگو سے ایک اچھا انسان بننے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے: "اچھا انسان بننے کے لیے جہد مسلسل اور محنت کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق کا ہونا بنیادی ضرورت ہے۔" اس وقت بھی انہوں نے طلباء کو شاہو کی بدتمیزی کا توجہ دیتے ہوئے ایسی ہی نصیحتیں کیں۔ شاہو نے ان باتوں کو کبھی غور سے نہیں سنا۔ وہ دن بدن اپنی بداخلاقیوں اور نالائقیوں میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ اور لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے نفرت اور ناراضی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شاہو کا والد بخی داد بستی میں خاصی شرمندگی اٹھانے کے بعد شاہو کو سمجھانے لگا۔ لیکن شاہو نہیں سنبھلا، تب مجبور ہو کر اسے گھر سے نکال دیا۔ لیکن شاہو پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ وہ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرتا اور جب جی چاہتا گھر آ جاتا۔ ایک روز اس کے باپ نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا: "اتنے روز کہاں رہے؟"

شاہو نے باپ کو لاپرواہی سے جواب دیا: "آپ مجھ سے محبت تو نہیں کرتے کہ میں دن رات آپ کی آنکھوں کے سامنے رہوں۔ بہن کی شادی ہوئی اور ماں کا چہرہ تک میں نے نہیں دیکھا۔ اب گھر میں میرے لیے کیا رکھا ہے۔"

اس کے باپ نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا: "کیا ہوا میں نے دو حرف نہیں پڑھے۔ لیکن میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔ میرے پاس تمہاری عمر سے زیادہ زندگی کو دیکھنے کا تجربہ ہے۔ تم سنور جاؤ۔ کوئی اچھا کام کر کے دکھاؤ۔ ایسا کام کہ دنیا یاد رکھے۔ پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ۔" شاہو نے مسکراتے ہوئے باپ کو جواب دیا: "آپ کیا سمجھتے ہیں صرف پڑھ لکھ کر ہی

لوگ بڑے بنتے ہیں؟ میں نہیں مانتا۔ آج کل وہ لوگ بڑے بنتے ہیں جو وقت کے ساتھ چلتے ہیں۔ میں بھی وقت کے ساتھ چلوں گا۔"

"آپ دیکھیں گے میں ایک دن کہاں کھڑا ہوں گا۔" اس کے باپ کی پیشانی پر تاؤ بڑھتا جا رہا تھا اسے شاہو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ ایک دن بے وقت آنے پر اس کے باپ نے پوچھا، "کھانا کھایا ہے؟"

"ہاں ہوٹل میں کھایا تھا۔ یہاں پر میرے لیے کیا پکا ہوگا۔ ہوٹل میں اچھا کھانا مل جاتا ہے۔"

پہلے تو وہ ہفتے میں ایک آدھ دن آ جاتا مگر اب مہینوں غائب رہنے لگا۔ اسکول میں اس کی بدمعاشی بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے والے ہیڈ ماسٹر نرم دل آدمی تھے لیکن نئے ہیڈ ماسٹر نے شاہو کی بدتمیزیوں اور بدمعاشیوں کو دیکھتے ہوئے اسے اسکول سے نکال دیا۔ اس طرح وہ دس جماعتیں بھی پاس نہ کر سکا۔ شاہو پر اب کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اب اسے اپنے محور پر اپنی منزل کا تعین کرنے میں آسانی تھی۔

اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اس کی بدمعاشیوں کو اس کی دلیری اور اعتماد کا نام دینے لگے تھے۔ اب وہ باقاعدہ ایک سیاسی پارٹی کا ممبر بن چکا تھا۔ وہ پارٹی میں اپنی کارکردگی کے حوالے سے اہمیت کا حامل بنتا جا رہا تھا۔ کہیں بھی کوئی جھگڑا یا فساد ہوتا تو شاہو وہیں موجود ہوتا۔ کبھی ناظم کے دروازے کو لات مار کر نکل جاتا تو کبھی تحصیلدار کا گریبان پکڑ لیتا۔ ایک روز تحصیل آفس میں باتوں باتوں پر شاہو نے میر دل مراد کا گریبان پکڑ لیا۔ میر دل مراد جو کبھی ایک نامور آدمی تھا، لوگوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر اس نے صرف یہ کہا، "پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں جو اب کنکر اہمیت حاصل کرنے لگے ہیں امیر دل نے درست کہا تھا۔ اب حالات اور طرح کے تھے وقت بدل گیا تھا۔ اور وقت کو سلام ہے۔"

اب سیاسی گٹھ جوڑ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

الیکشن کا دور دورہ تھا۔ شاہو کی پارٹی بھی نئے عزم اور نئے وعدوں کے ساتھ سامنے

آ چکی تھی۔ لیکن یاد رہے کہ پڑھے لکھے اور عمدار لوگوں میں کوئی ایسا نہیں تھا کہ وہ الیکشن میں کامیاب ہوتا۔ کافی سوچ بچار اور میٹنگز کے بعد پارٹی نے شاہو کی طرف دیکھا کیونکہ ان حالات میں شاہو کے علاوہ عوام کے دلوں میں گھر بنانے والا کوئی اور نہیں تھا۔ اس لیے شاہو کے کاغذات نامزدگی داخل کردیے۔ شاہو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی اپنی منزل تک پہنچنے کے راستے پر آ جائے گا۔ اس کے ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ اب وہ شاہو نہیں بلکہ میر شاہ میر تھا اور اپنے علاقے میں ایم پی اے کے لیے امیدوار تھا۔

ابتداء میں بہت سے لوگوں نے اپنے کاغذات نامزدگی جمع کرائے اور دوسری طرف انہوں نے الیکشن میں کامیابی کے لیے مختلف گروہوں کے درمیان تضادات بنا کر جھگڑے بھی کرائے، جس کی بنیاد پر خون کی ہولی کھیلی گئی۔ انہی حالات میں الیکشن کا ڈرامہ کھیلا گیا اور میر شاہ میر اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ اب ہر طرف اس کا نام مشہور و معروف تھا۔ اس کی کامیابی کا جشن منانے کے لیے رقص و سرور کی محفلیں سجائی گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ عوام کی رائے کبھی غلط نہیں ہوتی لیکن عوام کو اس بات کا شعور نہیں کہ ان کے لیے فیصلے اوپر کی سطح پر کیے جاتے ہیں جہاں لوگ اپنے مفاد اور اپنی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں اور عوام کو دھوکہ دینے اور ان کی سادہ دلی کا فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔

جب شاہ میر وزیر بنا تو اس کے نام کی طرح اس کا رویہ اور بول چال بھی خاصی بدل گئی۔ جیسے کسی میٹھی چیز پر چیونٹیاں جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اسی طرح شاہ میر کے اردگرد بھی دوستوں اور جاننے والوں کا مجمع رہنے لگا۔

راشد شاہ میر کا ہم جماعت رہا تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد کافی عرصہ بیروزگار تھا وہ ذہین نوجوان تھا لیکن اس کے پاس رشوت اور سفارش کے لیے کچھ نہ تھا۔ جب شاہ میر وزیر بنا تو ان کی پارٹی کے ایک عہدیدار، جو راشد کا بھائی تھا، اس کی سفارش پر وزیر صاحب نے اسے اپنا پی اے بنا دیا۔ راشد اپنی ذہانت اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے شاہ میر کو مشورے دیتا۔ کابینہ میں رہتے ہوئے قومی ملکی اقتصادی اور سیاسی حوالے سے راشد کی رہنمائی شاہ میر ایک کان سے

سنتا اور دوسرے کان سے نکال دیتا اور اپنے مزاج کی طرح اپنی مرضی کرتا رہتا۔

ہر رات کی طرح آج بھی وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں اعلیٰ سگریٹ کا پیکٹ اور دوسرے ہاتھ میں وسکی کا گلاس تھا۔ جام کا دور چلتے ہوئے رات کو رنگین کیے جا رہا تھا۔ چوتھے پیگ کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور فائل لانے کو کہا۔ ملازم نے فائل کے لیے کہا۔ راشد فائل لے کر اندر آ گیا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ شاہ میر جواب ایک عجیب سے سرور میں تھا۔ اپنے پیگ بنانے والے دوست سے بولا کہ راشد کے لیے بھی پیگ بناؤ۔ راشد کو شراب نہیں پیتی تھی لیکن وہ شاہ میر سے انکار نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

شاہ میر نے محسوس تو کیا لیکن چاہتا تھا کہ راشد بھی ان کی محفل میں شامل ہو جائے۔ اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے سب کو چیئرز کیا اور خوشی کے نام پر جام کو لب سے لگایا۔ اور راشد سے کہا، "ہاں اب بتاؤ اس ٹھیکے کا کیا بنا؟"

راشد گویا ہوا "واہ، یہ ایک بڑا منصوبہ ہے۔ اس سے عوام کو بڑا فائدہ ہوگا۔ وہاں کی لڑکیوں کو پڑھنے کی سہولت حاصل ہوگی پہلے کالج نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ آگے نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ اب انہیں پڑھنے کی سہولت حاصل ہوگی۔ میرا خیال ہے اس منصوبے پر جلد عمل درآمد ہونا چاہیے۔"

راشد کی بات سننے کے بعد شاہ میر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے گلاس اٹھایا اور ایک جام انڈیلتے ہوئے اپنے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "راشد صاحب یہاں ہم آپس میں بیٹھے ہیں۔ تم لوگوں کے فائدے اور سہولت کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس ٹھیکے میں مجھے کتنا فائدہ ہوگا۔ لوگوں کی ضرورت کیا ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔"

راشد خاموش تھا۔ اب اس کے کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ "دوستو تم لوگ کیا کہتے ہو؟" شاہ میر نے دوستوں کی رائے لی۔ "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست کہہ رہے ہیں۔" اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے دوست گویا ہوئے۔ "وقت یہی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ کل پتہ نہیں کیا ہوگا۔" شاہ میر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے نا عقلمندی کی بات! کل

ٹھیکے والی پارٹی آ رہی ہے۔ اب تم جاؤ اور تمہارا کام کیا کرنا ہے۔"

"اچھا واجہ" راشد نے اٹھتے ہوئے کہا اور فائل لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

رات کے دو بج چکے تھے مدہوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کھانے کی ٹیبل کی طرف گئے جہاں مختلف کھانے سجے تھے۔ انہوں نے زیادہ پینے کی وجہ سے بہت کم کھایا اور ایک آدھ نوالہ لینے کے بعد ہی نیند کی آغوش میں جانے کے لیے بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا لیکن شاہ میر اب تک بیٹھ وسکی کے دور چلا رہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں میں بلا نوش کے لقب سے مشہور تھا۔ ساتھ میں پیگ کے بعد گلاس اور بوتل کم نظر آنے لگے تھے۔ اس نے بمشکل پیگ بنایا اور جام پیتے ہوئے خود کلامی کرنے لگا۔ "لوگ کتنے بے وقوف ہیں کہ میرے جیسے آدمی کو اپنا رہنما بنایا۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتے ہیں۔ میں خود نہیں جانتا کہ سیاست کیا ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ سیاست سے بڑھ کر کوئی کاروبار نہیں۔ میں بھی کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔ یہی میرا مقصد اور میری منزل ہے۔ اے میری قوم اور اس کے معصوم لوگو یہ تمہاری بدنصیبی ہے کہ میرے جیسے لوگ تمہارے مقدر کا فیصلہ کرنے لگے ہیں۔"

کچھ دن بعد اسے اپنے علاقے کا دورہ کرنا تھا۔ وہاں کی انتظامیہ کو وزیر صاحب کے پروٹوکول کے لیے احکامات جاری کیے گئے اور آج وزیر صاحب بیس گاڑیوں کے کارواں کو لے کر روانہ ہو گئے تھے۔

دور نزدیک کے بہت سے لوگ سورج طلوع ہوتے ہی اپنے رہنما کے استقبال کے لیے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تحصیلدار، ناظم، اسمگلر، ڈرگ مافیا کے لوگوں کے علاوہ علاقے کے لوگوں کی بڑی تعداد بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وزیر صاحب شام کو پہنچ جائیں گے وہ صبح سے شام تک ان کے انتظار اور ان کے استقبال کے لیے اپنی وابستگی اور ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ آج شاہ میر کے باپ نے بھی عرصے کے بعد نئے کپڑے پہنے تھے۔ وہ بیٹے کے استقبال کرنے والوں میں کھڑا تھا۔

سرکاری اہلکاروں کے ساتھ ساتھ علاقے کے لوگ بھی اس کے والد سے بڑی عزت اور

عقیدت سے پیش آ رہے تھے۔ پہلے تو تحصیل کے چپراسی اور کلرک تک اس کو نہیں پوچھتے تھے۔ اسے اس عزت افزائی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟ اس نے ایک بار اپنی طرف دیکھا، پھر اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ ناظم، تحصیلدار، میر، معتبر اور دوسرے لوگوں کی طرف نظر دوڑائی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شاہو ہے۔ یہ وہی شاہو ہے! جو آج لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنا ہے۔ لوگ اس کی راہوں میں آنکھیں بچھا رہے ہیں اور وہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ یہ حقیقت تھی۔

قریباً شام کے چار بجے دور سے گاڑیوں کی اڑتی دھول میں ان کی گاڑیاں نزدیک آنے لگیں۔ شاہ میر کے باپ کو اپنے گزرے دنوں کی یاد آ رہی تھی اور شاہو کا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ شاہو نے کہا تھا، "بابا کون کہتا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے لوگ بڑے آدمی بن جاتے ہیں!" اس کے فکر و خیال کی رو اس دھول کا حصہ بن گئی جیسے شاہو کی گاڑیوں کی تیز رفتاری سے ہوا میں شامل ہو گئی تھی، جیسے کہ وہاں راشد کو بھی اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آگے کیا ہوگا، اس دھند اور گھٹن کا اختتام کیا ہوگا جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا!

حکیم بلوچ

بے گناہی کا گناہ

''میرا گناہ کیا تھا؟ یہ تم نے کیا کر دیا ؟ ریوالور کی پہلی گولی جب اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں پیوست ہوئی تو اس نے ایک چیخ ماری سرو آدھ بجر کر دوستا کے ریوالور کو تھامنے کے لیے لپکی اور دم توڑتی آواز میں کہا، ''دراتم پاگل ہوگئے ہو '' درا نے اسے دستے کے ساتھ دھکا دیا ''پاگل تم ہوئی ہو تم پاگل میں درجان کی طرح بے غیرت نہیں ہوں۔'' ریوالور سے ایک اور گولی نکلی۔ اس مرتبہ گولی زہبل کے دائیں پستان میں پیوست ہوکر دوسری جانب نکل گئی۔ گولی کی آواز پر پورا محلہ آدھمکا درا اور دوستا اپنی جیپ میں بیٹھ کر نکل گئے

زہبل کی بہن سر پر دوپٹہ لیے بغیر ننگے پاؤں کے ساتھ چیختی ہوئی نکل آئی۔ دیوانے زہبو کی طرح اپنے بالوں کو نوچنے لگی اور ہجوم میں گھس آئی۔ اپنی بہن کی کفن میں لپٹی لاش سے لپٹ گئی اور چیخ چیخ کر نڈھال سی ہوگئی محلے کے بڑے بوڑھے آگے بڑھے اور زہبل کو اپنی بہن کے بے جان بدن سے الگ کیا۔ کچھ اپنوں نے اس کی میت چار پائی پر ڈال دی اور اس کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ ملک عبدالعزیز نے آواز بلند کی اور کہا، ''واہ رے درا خان تمہاری مردانگی پر کون اپنے سیاہ سروں کو باؤلے کتوں کی طرح یوں گلی کوچوں میں مار کر پھینک جاتا

ہے اور پھر چور گیدڑوں کی طرح جو خوف کے مارے اپنی پناہ گاہ کی جانب جو نکتے ہوئے جاتے ہیں..... جب تک محلّے کے کتے اسے آ نہ لیں...... اب یہ صرف کتیا کی طرح ہیں۔ صرف بھونکتے رہتے ہیں۔ ان میں باز کوئی نہیں جو جھپٹ سکے۔"

"فقیر یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" ایک شخص نے اس سے پوچھا۔ ملنگ نے پھر مدد ہو کی صدا لگائی اور عصا اور کشکول کو سمیٹ کر اپنے ٹھکانے کی جانب کو چل دیا۔۔۔ وہ شخص پھر بولا، "ملنگ یہاں پر آہ و فغاں اور چیخ و پکار کی صدائیں ہیں۔ کیوں سب سہمے ہوئے ہیں۔ ابھی جہاز سے اتر کر آ رہا ہوں۔ یہ کیسا خون ہے جو مٹی کے ساتھ مدغم ہوا ہے، کتنا تازہ ہے۔ کیسی خوشبو اس خاک اور خون کی آمیزش سے پیدا ہو رہی ہے۔ کیا بات ہے؟"

ملنگ کے قدم رک گئے۔ وہ نوجوان کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ نوجوان حیران تھا کہ ملنگ مجھے کیوں اس طرح گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس نے دل میں سوچا، شاید یہ مجھے نہیں پہچان رہا۔ فقیر کے برابر دیکھتے رہنے پر نوجوان حیران و پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، الفاظ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ ملنگ کی آنکھیں نوجوان پر جمی ہوئی تھیں جبکہ نوجوان خاک و خون کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے خون آلود مٹی سے دل و جان کی وہی بہشتی خوشبو آ رہی تھی جو شہیدوں کی لاشوں کو دفنانے سے پہلے آتی ہے۔ ملنگ نے چیخ ماری اور اس قدر بلند آواز سے اللہ ہو کہا کہ آسمان لرز گیا۔ مگر نوجوان اپنی جگہ پر سنگ سیاہ کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے نوجوان کو بازوؤں میں لیا اور سسکی بھرے انداز میں گلے لگاتے ہوئے کہا، "میرے عزیز یہ تم ہو جو اس حال میں ہو۔"

نوجوان کو اب ہوش آیا اس نے کہا "ملنگ تم مجھے اب پہچان گئے۔" ملنگ نے خون میں گوندھی ہوئی مٹی کو ہاتھوں میں لیا اور سونگھتے ہوئے کہا، "سبحان اللہ کتنی اچھی خوشبو ہے۔" پھر اسے نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، تم بھی سونگھو۔" نوجوان بولا، "اسے سونگھنے کی ضرورت نہیں مجھے۔ اس کی جنتی مہک کی خوشبو نے بے سدھ کر دیا ہے۔ یہ کس کا خون ہے، کیسے چھلک پڑا ہے؟ کس نے اتنی بے رحمی کے ساتھ اس خاک پر بہا دیا ہے۔

"سونگھ کو خود سمجھ جاؤ گے" ملنگ نے اپنا ہاتھ بورجان کی طرف بڑھا دیا۔ بورجان نے اس قدر زور سے چیخ ماری اور اپنی جگہ سے اچھل پڑا جیسے اس کے دل کو ایک تیر چھید گیا ہو۔ کچھ عرصے پہلے بھی اسے محسوس ہوا جیسے اسے کوئی تیر لگا ہے۔ اس نے اسے وہم قرار دیا، کوئی برا خیال سمجھا، مگر سچ یہ، میں خوفزدہ ہوا، میری امید میری محبت ... "زیبل یہ تم تھی ... کس نے تمہاری جان لی ہے ... ناحق تمہاری جان لی ..." وہ بے خودی میں کہنے لگا۔ پھر ملنگ کے ہاتھ سے مٹی چھین کر سونگھنے لگا۔ "اف، تمہاری سرخ ہونٹوں کی لالی پر کیوں نا مرا ... میں نہیں جانتا تھا ورنہ میں اتنی پشیمانی اور بے عزتی نہ سہتا ... تمہیں طلاق نہ دیتا ... میں تم سے الگ اس لیے ہوا کہ تمہاری محبت سے دور نہ ہو جاؤں ... میں نے دل میں کہا" کہ میں طلاق کے تین بول بول کر یہ تین سنگ نہ پھینکتا جو باہم ہونے کی ایک رسم اور روایت ہے جو آدم و حوا کی جو ازل سے ابد تک رواں اس محبت کو ابد ماننے کی روایت ہے ..." اسے خیال آنے لگا ... اپنا بھائی، ازبل و زیبل کی زندگانی، پرورش، شادیاں، غم اور خوشیاں پھر سے یاد آنے لگیں۔

ازبل اور زیبل دونوں کے والدین وبائی امراض کے سال ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ان کے چچا میران دونوں کو اپنے گھر لائے اور اپنے فرزندوں کی طرح پرورش کی۔ ان کے والدین کی جائیداد کو گروی رکھ کر ان کی تعلیم اور دوسری ضروریات کی انتہائی اچھے طریقے سے نگہداشت کی۔ ازبل عمر کے لحاظ سے زیبل سے بڑی تھی جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو چچا میران نے ان کی شادی اپنے بڑے بیٹے دراے کی۔ زیبل ازبل سے تین سال چھوٹی تھی۔ لیکن قد و قامت اسی سے مشابہ تھا۔ دونوں میں سے زیبل اور ازبل کو امتیاز کرنا مشکل تھا کیونکہ خوبصورتی اور آبیاری میں دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ زیبل تعلیم کے مقابلہ اپنی ہمشیرہ سے تیز تھی اور اس نے اسی سال ہی میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا جب کہ اس کی بہن اس امتحان میں تھرڈ ڈویژن آئی۔ پورے بورڈ میں زیبل نے دوسری پوزیشن لے کر داد وہ سمیٹی اور سرکار نے اُسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی خاطر ماہوار وظیفہ جاری کر دیا۔ سات سال کے طویل عرصے میں انہوں نے لاہور سے ڈاکٹری کا امتحان

امتیازی نمبروں سے پاس کیا اس کے بعد اس کے چچا نے اپنے بیٹے بورجان کی شادی زبیل سے کروادی۔ بورجان مسقط فوج میں کیپٹن تھا۔ اس نے اپنے اہل وعیال کے لیے ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دونوں بہنیں اچھے طریقے سے رہ گئیں۔

جب بورجان کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ مسقط چلا گیا۔ اس نے بڑے بھائی، اپنی بیوی یعنی زبل اور بھابھی زبیل کے ساتھ یک ہی حویلی میں سکونت اختیار کی۔

پانچ سال کی طویل مدت ایسے حالات میں گزر گئی جس کا کوئی لمحہ خوشیوں سے خالی نہ تھا۔ زبیل کی گود میں دوسال کا نونہال موجود تھا۔ جب درا باہر کی طرف سے گھر میں داخل ہوتا تو وہ اس بچے کو زبیل کی گود سے اٹھا کر بوسہ دیتا اور اس سے محبت کا اظہار کرتا۔ زبیل کو یہ بات ٹھیس پہنچاتی اور وہ خیال کرتی کہ بارہ سال سے زائد وقت گزر گیا، ان کے ہاں اولاد نہیں ہے اور وہ اس لیے بچے کی محبت اور پیار کی وجہ سے میرے بیٹے کو دوست رکھ رہے ہیں۔ ہر وقت زبیل سے کہتا کہ آپ کیسی خوش نصیب خاتون ہیں۔ آپ نے میرے بھائی کو خوبصورت لخت جگر دیا ہے۔ زبیل سے مخاطب ہو کر کہتا کہ تم بخت ور ہو، تمہاری بہن بدنصیب اور مجھے الزام لگاتی ہے کہ تم کمزور اور ناتواں ہو ڈاکٹر زبیل نے اسے تسلی دی کہ ڈاکٹری کا پیشہ آگے آ گیا ہے اس معاملے میں میں آپ لوگوں کا علاج کروں گی۔ اگر خدا چاہے گا تو آپ لوگوں کو لخت جگر کی رحمتوں سے محروم نہیں کرے گا۔

درا اپنے آباو اجداد کا ایک ہی اثاثہ تھا اور وہ اپنے والد کی وفات کے بعد تمام جائیداد کا وارث بن گیا۔ بھائی کا حصہ بھی اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اپنی بیوی اور بھابھی کا مال ومتاع اس کے ہی ہاتھ میں تھا۔

مسقط کے پیسے اور بھابھی کی تنخواہ بھی اس کے پاس تھیں۔ اور اس نے اپنے لیے ایک گاڑی خریدی اور اس کے مراسم اسمگلر لوگوں کے ساتھ تھے۔ یہ تمام مال ومتاع مفت تھے۔ کیوں کہ اسے بے اولادی ہر وقت ستاتی تھی۔ جہیز ادا کرنے کی وجہ سے وہ دوسری شادی بھی نہ کرسکتا تھا۔ بیوی کا مال ومتاع اس کے پاس تھا۔ ان تمام چیزوں کا چھوڑنا اس کے لیے ناممکن

تھی۔ وہ ہر وقت چاہتا تھا کہ وہ تمام جائیداد کا وارث ہو اور اسے حویلی میں میراث کی نسبت سے حصہ بھی ملے۔

بور جان کو اپنے بھائی کی طرف سے بھیجے جانے والے خط حرف بہ حرف ناگہانی لمحات سے آگاہ کرتے رہتے اور بھابھی پر اس نے ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کے ساتھ عاشقی اور تہمت جیسی حقارت آمیز الزامات بھی لگائے۔ کیپٹن بور جان خط کی ایک فوٹو کاپی اپنے وفادار بیوی کے ہاں روانہ کرتا ہے اور یہ جستجو کرتا ہے کہ یہ کیسی باتیں ہیں اور کیا ہو رہا ہے جو میرے بھائی نے تمہارے حوالے سے رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر زہبل جواب دیتی تھی دوسرا بچہ جو میرے حمل میں ہے، وہ آپ کا اپنا خون ہے میرے ساتھ ہسپتال میں جو ملازم ہے وہ میرا شوہر نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ میرے کوئی مراسم ہیں۔ میرے بارے میں آپ بالکل اپنی دل کو تسلی دیں۔ میری محبت آپ کے لیے ازل سے ابد تک رہے گی۔ یہ تہمت جس نے میرے بارے میں بھیجی ہے اس کے بارے میں مجھے بتاؤ۔ اس ناحق جھوٹ کا خود پردہ فاش کروں گی۔ میرے تعلقات صرف آپ ہی سے ہوئے ہیں۔ کسی دوسرے سے نہیں۔ میں دوسری عورتوں جیسی نہیں کہ جب ان کے شوہر کسی دوسرے ملک میں ملازمت کے لیے سکونت پذیر ہوں اور ان کے مراسم اور تعلقات دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوں میں دیہاتوں میں پلی بڑھی ہوں۔ یتیم اور مسکین ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتی اور بے بس ہوں۔ میں بنیادی طور پر ایک باعزت عورت ہوں۔ مجھے دنیا کی کسی چیز کی تمنا نہیں۔ میں اپنے بوڑھوں کی قبروں کی خاطر اور میں اپنے عزت کو بچانے کی خاطر جان بھی دے سکتی ہوں ابھی آپ خود فیصلہ کریں کہ محبت بڑی چیز ہے یا نفرت۔ لہٰذا میری محبت کو کبھی بھی نفرت سے بدل نہ دیں۔

پورا سال گزرنے کے باوجود بور جان ملک واپس آیا اور نہ ہی کوئی خط اپنے بیوی کے لیے روانہ کیا پورے ایک سال کی چھٹی اس نے سیر و تفریح میں گزار دی۔ اپنی بیوی کی طرف سے بھیجے ہوئے خط کو اس نے جیب میں ڈال دیا۔ جب بھی اکیلا ہوتا تو اس کو نکال کر پڑھتا تھا۔ اس کا دوسرا بیٹا بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن اپنے علاقے میں آنا اس کے لیے مشکل تھا۔ لیکن ڈرا اپنے

جذبات پر قابو نا پاسکا۔ اسے ہر مہینے شکوے شکایت کے خطوط بھجوائے جاتے تھے۔ ایک دن کیپٹن بور جان بے بس ہوا اور نا چاہتے ہوئے اپنی پیاری بیوی کو طلاق بھجوا دی لیکن تمام مال متاع، جائیداد اپنی بیوی اور بچوں کے نام کردی اور اپنے بھائی کو ایک خط لکھ کر تعلق، رشتے ختم کرنے کا کہا اور اپنے دو بچوں اور زینبل کا حصہ انہیں دینے کا حکم دیا۔

زینبل ایک سال کے اندر پریشانیوں کا شکار ہوگئی۔ ڈرائی مں، بھنوں کی زہریلی باتوں کی وجہ سے بور جان کے دل میں مختلف خیالات، وسوسے آتے رہے اس کے دل میں اس کے دماغ میں ایسے ناگوار اثرات چھوڑے۔ ایک دن اسے زینبل اور اس کے اسٹاف ڈاکٹر کی شادی کی خبر ملی اس نے دل میں سوچا کہ زینبل مجھ سے دشمنی پر اتر آئی ہے جیسے مہناز نے شہداد کے ساتھ کیا تھا۔

بور جان کئی برسوں کے بعد علاقے میں آیا وہ زینبل کو شادی کی مبارک باد دینے کی بجائے اس کو تہذیب دینے چلا گیا۔ ملک عبدالعزیز بور جان ابھی تک اسی کیفیت میں تھا۔ وہ اپنے غم اور دکھوں میں اس قدر تھا کہ وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کہیں زخمی ہونٹوں کی اس کو خبر نہیں تھی   ملنگ نے اسے جھنجھوڑا، ”تم نے اپنے ہونٹ خون آلود کیے ہیں۔ یہ کونسا سوہان ہے کہ جس نے تمہیں چھلنی کر دیا ہے۔ دل کو مضبوط کر دو میرے گھر آؤ۔ اصل بات بتاؤ۔ بور جان ہوش میں آیا۔ ایک سرد آہ بھری خاک آلود ہاتھ خون میں شامل ہوئے۔ ملنگ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور اللہ ہو نعرہ لگاتے ہوئے، بورجان کا ہاتھ اپنے عصا اور کشکول کی طرف بڑھایا اور وہ انہیں لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر شہر کے درمیان میں تھا۔

لوگ مختلف جگہوں میں جا کر بسے تھے لیکن ملنگ اپنی پرانی جگہ پر رہتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں وہ پرسکون گھر میں آئے۔ بور جان نے محسوس کیا کہ سورج کے شیشز اور لو کو وہ دہلیز سے باہر چھوڑ آئے ہیں۔ ملنگ نے اسے ٹھنڈے شربت کا گلاس دیا بور جان نے ایک گھونٹ میں پی لیا۔ ملنگ سے سوال کیا، ”کس نے ڈاکٹر زیب جان کا قتل کیا تھا   ؟“ ملنگ نے بور جان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ”ان تین برسوں میں معصوم زیب جان کے ساتھ جو تکالیف

ہوگئیں، تم ان سے بے خبر رہے ... سالا، سالیاں ہم زلف اور بھائی نہیں ہونے چاہئیں"
بورجان نے سوال کیا "کیسے ... کیا مطلب" منگ نے کہا، "جیسے تم لوگ!
تمہارے بھائی ورا نے تم سے سات سال پہلے شادی کی تھی لیکن وہ اب تک بے اولاد ہے۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کو کمزوری کا طعنہ دیتی ہے۔ تمہارا بھائی اسے بانجھ قرار دیتا ہے۔ تمہارے گھر میں دوسرے سال اولاد ہوئی اس کے بعد مسئلے بڑھ گئے۔ بورجان نے کہا، اولاد اللہ کی دین ہے اس کی وجہ سے میاں بیوی میں الزام تراشیاں عجیب ہیں۔ منگ نے کہا "یہی راز ہے جو لوگ جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے۔ یہی ناسمجھی تمہارے گھر کی تباہی کا باعث ہے۔ سنو ... ایک دن ڈاکٹر زیب جان نے مجھے چھپ کر اپنے گھر بلوایا وہ بے چین اور افسردہ تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اس نے کہا "منگ واجد میر باپ کی جگہ ہے۔ ایک خدا کی عبادت کرنے والے ہیں۔ سوچتی ہوں۔ زہر کھا لوں پھر سوچتی ہوں اپنے ہونے والے بچے کو ضائع کرا دوں" "کیوں کس لیے ... ؟ بورجان نے تڑپ کر کہا "میں نے بھی اس سے سوال کیا" منگ نے بورجان کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں نے اسے منع کیا اور ان باتوں کو حرام قرار دیا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور بلک بلک کر رونے لگی میں نے اسے تسلی دی۔" اس دوران بورجان نے بے صبری کے ساتھ کہا، "کیا وہ بچہ کسی اور کا تھا" حالانکہ زیب کہہ چکی تھی کہ یہ میرا خون تھا۔ منگ نے غصے میں آ کر کہا "تم کو سفید و سیاہ کا صاف پتہ چل جائے گا۔" بورجان نے سرد آہ بھری اور کہا تم اپنی بات جاری رکھو۔ عمر رسیدہ منگ نہیں جانتا کہ احوال کس طرح دیا جاتا ہے بلکہ دل پر پتھر رکھ کر کہا، "معصوم زیب جان نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ بچی تھی۔ وہ تمہارا ہی خون تھا لیکن بچہ تمہارے بھائی کا تھا۔ اس نے زنجبل کے ساتھ زیادتی کی تھی۔"

بورجان چونک گیا اس کی زبان خشک ہوگئی تھی۔ منگ اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی رہی۔ وہ دونوں سر جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے وہ ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملا پا رہے تھے۔ ایک بات بتانے پر اور دوسرا سننے پر ... بورجان نے اچانک منگ سے سوال کیا۔

''میرا بھائی یہ ذلت آمیز کام کیسے کر سکتا ہے اور وہ بھی میری بیوی کے ساتھ۔ اپنی بیوی کی بہن کے ساتھ۔ یہ نہیں ہو سکتا ملنگ خدا کے لیے اصل بات کیا تھی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔''

ملنگ نے دکھی دل کے ساتھ جواب دیا

''ایسا نہ ہوتا مگر ایسا ہو گیا۔ زیبل کہہ گئی تھی پہلی رات اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ خواب میں آ گئی تھی۔ دوسری مرتبہ جیسے غیر ارادی طور پر گئی اور تیسری مرتبہ اس کا شکار ہو گئی۔ وہ بچے کو دیکھنے کے بہانے آیا اور میرے دودھ کے گلاس میں خواب آور گولیاں ڈال دیں میں جب نیند میں کھو گئی پھر اس نے میرے ساتھ جو کیا وہ میں بتا نہیں سکتی۔ اس نے اپنی تہمت اور میری بہن کی کمزوری دونوں کو بنیاد بنا کر مجھ سے بدلہ لیا۔ اپنے اوپر تہمت کو چھپا کر میری زندگی برباد کرتا ہے۔ اب مجھے کوئی رستہ بتا۔۔ ۔میں نے اسے کہا کہ صبر کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جب تک بچہ نہ ہو اور تمہارا شوہر نہ آئے۔ تمہارے بھائی نے پہلے ہی جھوٹا خط لکھ کر تمہیں غصہ دلایا اور تم نے اُسے طلاق دے دی۔''

''میں نے اسے کہا تھا کہ اس ڈاکٹر کے ساتھ شادی کرے جس کے ساتھ اس کے مراسم ہیں،'' بورجان نے یہ بات غیر ارادی طور پر کہہ دی۔ ملنگ نے کہا ''اب تم جان گئے ہو گے کہ زیبل کے ساتھ کسی کے مراسم نہیں تھے۔ صرف آپ بھائی کی زبانی'' بورجان نے ملنگ کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا ''لیکن اُسے مارا کس نے؟''

''اُسے تمہارے بھائیوں نے میری موجودگی میں فائرنگ کر کے یہ کہتے ہوئے مار دیا کہ ہم بورجان جیسے بے غیرت نہیں ہیں''

''انہوں نے سچ کہا ہے کہ بے غیرت میں ہوں کہ میں نے ان کی جھوٹی باتوں پر یقین کیا اور اپنی بیوی کو طلاق دی'' بورجان نے ملنگ سے کہا ''جس طرح کہ بلوچ نے کہا ہے کہ بیوی خوشیاں دیکھے گی اور بھائی تکالیف کو برداشت کریں گے۔ اب بلوچ کی بات الٹ ہو گئی۔ بے غیرت و ناموس کو اپنے لوگ برباد کرتے ہیں۔ میں اب اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اتنا کہنے کے بعد بورجان طیش میں غار سے نکل کر گاڑی کی طرف چلا گیا۔

منگ غار سے نکل گیا اور انہوں نے دیکھا کہ سورج اپنی آخری پناہ گاہ میں ڈوب رہا ہے۔ اور مغرب کی طرف زردی پھیلی ہوئی ہے۔ منگ پر زنبیل کا زرد چہرہ ظاہر ہو گیا۔ کل شگوف کی آواز پورے علاقے میں سنائی دی اور فضا میں زنبیل کی خوبصورت مسکراہٹ پھیل گئی!

پروفیسر عزیز جگنی

ہانی اب بھی بے بس

مراد بارہ جماعتیں پڑھنے کے بعد گاؤں کے اسکول میں استاد کی حیثیت سے ملازم ہوا۔ دو کمروں پر مشتمل سکول میں کوئی صحن تھا اور نہ چار دیواری تھی۔ پہلی سے پانچویں جماعت تک طالب علموں کی تعداد بیس تھی۔ اسکول میں تعینات ایک اور استاد تھا جو اسکول انچارج کے طور پر فرائض انجام دے رہا تھا۔ مراد کی تعیناتی اسکول اور طلباء کے لیے خوش بختی ثابت ہوئی۔ اب طالب علم روزانہ باقاعدگی سے پڑھنے لگے۔ طلبا کہتے، ”سر، آپ کے آنے سے پہلے ہم ہفتہ میں تین چار روز تو چھٹی پر رہتے تھے۔“

مراد نے کہا کہ ”ہم صرف دو استاد ہیں۔ چھٹی کریں گے، تو آپ کی پڑھائی بے حد متاثر ہوگی۔“ مراد نے اپنے دوست باران سے کہا کہ ہم دونوں کا تعلق اس علاقہ سے ہے اور بچے بھی اس گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ استاد کے علاوہ بھی ہمارے کچھ فرائض بنتے ہیں۔ آپ اسے فرض کہیں یا بچوں کا حق......

باران کے لیے اس فیصلہ کو تسلیم کرنا کافی دشوار تھا۔ کیونکہ اب بھی وہ کبھی کبھار غیر حاضر رہتا۔ مراد نے اس حرکت پر ناراضی کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ آپ بے شک چھٹی کر لیا کریں

مگر مجھے چھٹی اطلاع دیں تاکہ میں ذہنی طور پر تیار ہو کر اسکول آیا کروں۔ آخر کار اس نے بھی مراد کے عزم سے متاثر ہو کر اپنی پرانی عادت ترک کر دی۔ دونوں کے باقاعدگی سے اسکول آنے سے طلبہ کی تعداد اچانک بیس سے تیس اور پھر پینتیس تک پہنچ گئی۔ مراد کو یہ سارے بچے طالب علم سے زیادہ اپنے بچوں کی طرح لگتے۔

اب طلبہ نے بھی اسکول کے ماحول کو گھر کی طرح محسوس کیا۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں طلبا کی شرکت نے اساتذہ کے حوصلے بھی بلند کر رکھے تھے۔ مراد اور باران بچوں کے ساتھ مل کر اسکول کی چار دیواری میں ایک سایہ دار چھت بنائی۔ گاؤں کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اس اچانک تبدیلی سے بچے بڑی خوشی کے ساتھ اسکول جانے لگے ہیں۔ مراد کے والد اور ان کے بھائی وڈیرہ کی زمینوں پر مزارعے کے طور پر کام کرتے تھے۔ انہوں نے مراد کی تعلیم و تربیت کے لیے سرتوڑ کوششیں کی تھیں۔ مراد کالج میں پڑھائی کے دوران بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مصروف بھی رہا اور اس آمدنی سے اس نے اپنے لیے ایک موٹر سائیکل خریدی، جو اس کے کام کاج میں بے حد مددگار ثابت ہوئی۔ مراد نے گاؤں میں ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کھول لی اور موٹر سائیکل کے ذریعے قریبی شہر سے سامان لے کر آتا رہا۔

مراد کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد اس کے ماں باپ نے اس کی شادی اپنے ایک دور کی رشتہ دار بانل سے کرا دی۔ وہ بھی وڈیرہ کے ایک مزارعے کی بیٹی تھی۔ بانل انتہائی خوبصورت تھی۔ پورے گاؤں میں اس کی خوبصورتی کا چرچا ہوتا۔ وہ گھریلو کام کاج میں بھی بے حد مہارت رکھتی تھی۔ وہ ساس اور سسر کی خدمت میں کسی بھی پس و پیش سے کام نہیں لیتی تھی۔ مراد ایک ایسا نوجوان تھا جو بیوی کو محض بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے برابر خیال کرتا تھا۔ اس نے بانل کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن بانل نے مراد سے کہا کہ بیویوں کا کام گھریلو کام کاج ہی تو ہوتا ہے اور ایسی کوئی روایت نہیں کہ شوہر اپنی بیویوں کو پڑھائیں۔ مراد نے کہا کہ تم صرف میری بیوی نہیں بلکہ میری دوست بھی ہو۔ میاں بیوی کی دوستی ہی سے یہ رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔ روایتی اقدار بے شک

خوبصورت ہوتی ہیں مگر وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی ہی اصل شعور ہے جس سے ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت پر اچھا اثر پڑے گا۔ ہائل نے شرماتے ہوئے کہا کہ یہ پیش بندی ہے ابھی بچے پیدا ہی نہیں ہوئے۔

مراد نے اردو قاعدے کے ساتھ ساتھ انگریزی قاعدے سے ہائل کی پڑھائی کی ابتداء کی۔ ایچ اور اے پر زبر کر مراد نے کہا کہ اس سے میری ہائل کا نام بنتا ہے۔ ہائل نے کہا کہ مراد آپ مجھے پڑھا رہے ہیں یا شاعری کر رہے ہیں۔ مراد نے کہا کہ یہ شاعری نہیں حقیقت میں ان الفاظ سے ہائل کے نام کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہائل نے کہا کہ اگر ایچ سے مراد ہائل ہے تو میم سے مراد بنتا ہوگا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میم سے مراد ہی نہیں ہائل کا مرید بھی بنتا ہے۔

تھوڑے ہی عرصے میں ہائل نے بہت کچھ سیکھ لیا اب وہ گاؤں کی پڑھی لکھی خاتون شمار ہونے لگی۔ ہائل کی خوبصورتی کا چرچا تو پہلے سے تھا، اب اس کے تعلیم یافتہ ہونے کا بھی تذکرہ ہونے لگا۔ مراد نے ہائل سے کہا کہ وہ اپنے ہمسائے کی بچیوں کو گھر میں تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر دے۔ ہائل نے کہا کہ یہ مشکل کام ہے، میں کیسے ایسے کر سکتی ہوں۔ مراد نے کہا کہ اس میں مشکل والی کون سی بات ہے۔ جو کچھ تم پڑھ چکی ہو، وہی تعلیم بچیوں کو دو۔ ہائل نے کہا کہ ہاں، میں کچھ نہ کچھ ان کو پڑھا سکتی ہوں۔

آخرکار ہائل کی کوششوں سے علاقے کی دو بچیاں اس کی شاگرد بن گئیں۔ گاؤں کے قریب ندی سے خواتین پانی لے کر آتی تھیں مراد نے ہائل سے کہا کہ آئندہ میں خود پانی لایا کروں گا۔ ہائل نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ باقی گھروں سے خواتین پانی لے کر آئیں اور آپ مرد ہو کر وہاں سے پانی لائیں جس سے خواتین کے لیے مسئلہ پیدا ہوگا۔ مراد نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، لوگوں کو بولنے دو۔ میں موٹر سائیکل پر پانی لایا کروں گا کیونکہ آپ پڑھانے کی ذمہ داری پوری کرتی ہے۔

مراد وڈیرے کو اکثر و بیشتر ندی کے پاس دیکھ چکا تھا اور وڈیرہ تو زور آور تھا۔ کئی مرتبہ مراد

کو شہر جاتے ہوئے کوئی نہ کوئی ذمہ داری دے کر اپنے وڈیرہ ہونے کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ شاید وڈیرے کے نظر انداز کرنے کو مراد نے محسوس کیا تھا۔ مراد بلا وجہ کبھی بھی وڈیرہ کے ڈیرے پر نہیں جاتا تھا وہ اس قدر مصروف رہتا تھا کہ اسے اسکول، گھر اور بچوں کی تعلیم سے وقت نہیں ملتا تھا۔ علاقے کے لوگ مراد کی صلاحیتوں اور ہمدردی سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ اکثر و بیشتر اس کا تذکرہ کرتے تھے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ سب کچھ وڈیرے کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وڈیرے نے اپنے دوست فیضو سے مراد کی بڑھتی ہوئی حیثیت اور اپنے کاموں سے انکار کا تذکرہ کیا۔ فیضو نے کہا کہ واقعی وہ پڑھا لکھا ہے۔ اس کی بیوی کی قدر اور آؤ بھگت نے اسے مغرور بنایا ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز اسے نہیں رہی۔ وڈیرے نے کہا کہ فیضو، کل مراد کو میرے گھر لے کر آؤ، اس سے تھوڑا سا کام ہے۔ دوسرے دن وڈیرہ کے پیغام پر مراد اس کے ڈیرے پر پہنچا۔ وڈیرہ نے کہا کہ ماسٹر صاحب، آپ گاؤں کے لوگوں کے پاس تو جاتے ہیں لیکن غلطی سے بھی ہماری طرف نہیں آتے۔ مراد نے کہا، کہ وڈیرہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں میرے کام اتنے بہت سارے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ وڈیرہ نے کہا کہ ماسٹر ہمارا منشی کچھ دنوں کے لیے شہر گیا ہوا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے حساب کتاب میں ہاتھ بٹانے کے لیے شام کو آیا کریں۔ مراد نے کہا کہ وڈیرہ، آپ کو علم ہے میں تو بے حد مصروف ہوں لیکن پھر بھی ایک دو دن بعد ضرور چکر لگایا کروں گا۔ فیضو نے کہا کہ وڈیرہ یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ اپنی مصروفیت سے آپ کے لیے وقت نکالے کیونکہ ان کے گھر پر بھی پڑھائی کا سلسلہ جاری ہے۔ میری بیٹی بھی پڑھنے جاتی ہے، بیوی کو تو بڑے زوروں سے روک رکھا ہے۔ مراد نے فیضو کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور جاتے ہوئے کہا کہ وڈیرہ ٹھیک ہے جب تک آپ کا منشی آئے، میں آپ کا ہاتھ بٹاتا رہوں گا۔

وڈیرہ نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ مراد کے جانے کے بعد فیضو نے کہا وڈیرہ جتنے لوگ مراد کے گھر جاتے ہیں اتنے تو آپ کے گھر کبھی نہیں آئے۔ وہ بچوں کو پڑھانے کے علاوہ لوگوں کے روز مرہ کے مسائل بھی حل کرنے لگا ہے۔ بچیوں کے علاوہ علاقے کے خواتین نے بھی جانا شروع کر دیا ہے۔ میری اپنی بدصورت بیوی بھی جانے کی خواہش رکھتی ہے۔ وڈیرہ مسکرایا، تم اپنی

بیوی کو ہر وقت بدصورت کیوں کہتے ہے۔ جیسی بھی ہو وہ تمہاری بیوی ہے۔ فیضو نے کہا کہ وڈیرہ آپ مائی باپ ہیں اسی لیے میں آپ کے سامنے سچ بولتا ہوں۔

وڈیرہ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

مراد اور ہائل اپنے گھر میں بیٹھے تھے مراد نے کہا کہ دیکھو تمہارے پڑھانے کے فیصلے سے گاؤں کی کتنی بچیوں کا فائدہ ہوا ہے۔ ہائل نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے مگر اصل سچ یہ ہے کہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوسکا ہے کہ میں بچیوں کو دلچسپی سے پڑھا رہی ہوں۔ مراد نے کہا کہ ہائل میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس شکر کے لیے الفاظ نہیں۔ ہائل نے کہا کہ ایسی کیا بات ہے۔ مراد نے کہا کہ کیا یہ کم ہے کہ مرید اپنی ہائل کو حاصل نہیں کر پایا۔ میں اپنی ہائل کو پانے میں کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ ہائل نے کہا پھر تو یوں سمجھا جائے کہ تم میرے مرید ہو۔ مراد نے کہا کہ ہائل شکر کرو کہ تمہیں کسی چاکر نے مجھ سے نہیں جیتا۔ ہائل نے کہا کہ ایسی باتیں مت کیا کرو۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اب وہ اور خوش رہنے لگے۔

عید کے دن حسب روایت مرد اور عورتیں وڈیرہ کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس مرتبہ بھی عید ملنے وڈیرہ کے گھر گاؤں کی خواتین و مرد چلے گئے۔ وڈیرہ ہائل کو ایک نظر دیکھ کر اپنے حواس کھو چکا تھا۔ دل میں خیال کیا کہ مراد ہائل کے قابل نہیں۔ فیضو کی بیوی کو دیکھ کر اسے فیضو کی باتوں کا یقین ہوگیا کہ وہ بیوی کی بدصورتی کا تذکرہ کرنے میں حق بجانب ہے۔ دوسرے دن فیضو سے مل کر وڈیرہ اور اس کے درمیان دیر تک اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں جس میں مراد ہائل کا تذکرہ بار بار آتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد وڈیرہ نے مراد کو پیغام بھیجا کہ وہ شہر جارہا ہے تو وہ فیضو کے گھر سے میرے ٹریکٹر کا ایک پرزہ، جو خراب ہو چکا ہے، لے کر ٹھیک کرانے لے جائے۔

مراد نے آکر وڈیرہ کو کہا کہ ٹھیک ہے اگر ٹریکٹر کا پرزہ مرمت ہوسکا تو کرا کر لے آؤں گا۔ یہ بات طے ہوگئی۔ دوسرے دن مراد فیضو کے گھر گیا۔ فیضو کو آواز دی مگر فیضو کی بیوی نے جواباً کہا فیضو تو گھر پر نہیں ہیں مراد بھائی، اگر کوئی کام ہے تو بتا دیں۔ مراد نے کہا کہ ادی مجھے

وڈیرہ نے کہا ہے کہ میں فیضو کے گھر سے ٹریکٹر کے ناکارہ پرزے کو مرمت کے لیے لے کر جاؤں۔ میں نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ اتنے میں فیضو نے دیوار کی اوٹ سے نکل کر کلاشنکوف کا ایک برسٹ چلاتے ہوئے شور مچانا شروع کیا کہ میں نے مراد کو اپنی بیوی کے ساتھ سیہ کاری کرنے پر قتل کر دیا ہے۔

فوراً ہی لوگ جمع ہو گئے اور لوگوں کو اس بات پر ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا کہ مراد ایسی کوئی جرأت کر سکتا ہے کیونکہ انہوں نے آج تک گاؤں کی خواتین کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ مراد تو عزت کا نگہبان تھا اس سے کسی کی عزت کو لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ ناممکن کی بات ہے۔ فیضو موٹی موٹی گالیاں دے کر لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ وڈیرہ نے کہا کہ مجھے بھی حیرت ہے کہ مراد اپنی اس قدر خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر ایسی بدصورت عورت کے پاس کس لیے گیا تھا۔ انسان کی نیت کے خراب ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے، چھوڑو ان باتوں کو چھوڑ کر ان کو دفنانے کا انتظام کرو۔

بانل کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو ننگے سر ننگے پاؤں چیختے چلاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئی اور سیدھے مراد کی لاش پر گر کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی آخر تمہیں ظالموں نے ختم کر ڈالا۔ اس نے مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ میرے بھائیو! آپ تو مراد کو اچھی طرح جانتے تھے۔ گاؤں کی ساری خواتین کو وہ ماں اور بہن کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ اگر کوئی اس قدر مرد بنتا ہے تو وہ مراد پر سیہ کاری کا الزام لگا کر قتل کی بجائے ویسے ہی اس کا مقابلہ کرتا۔ فیضو نے کہا کہ جب میں نے اپنی آنکھوں سے سارا ماجرا دیکھا ہے۔ اب کسی کے گواہی کی کیا ضرورت ہے۔ بانل نے فیضو کو بغیر جواب دیے، وڈیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اب تمہارے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ مراد جیسے لوگوں کو تم زندہ کیسے برداشت کر سکتے ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ گاؤں کے بچے اور بچیاں تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ مراد کو قتل کروا کر تم نے پورے گاؤں کو نامرادی کا تحفہ دیا ہے۔ مراد کے قاتل کبھی بھی بامراد نہیں ہو سکتے۔ اسی وقت بانل کا سسر اس کو گھر لے گیا۔ بانل نے چلاتے ہوئے اپنے سسر سے کہا کہ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ مراد کو وڈیرہ کے ایما پر قتل کیا گیا ہے۔

مراد کے باپ نے ہانل کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ تم ان باتوں کو چھوڑ دو۔ اس کا فیصلہ سردار خود کریں گے۔ ہانل نے کہا کہ وڈیرے کو کون مجرم قرار دے سکتا ہے۔ وڈیرہ اور سردار ایک دوسرے کے بازو ہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت اور ایک دوسرے کی کمزوری ہیں۔ مراد اور ہانل کا اس دنیا میں کون ہے۔ وہ کافی دیر تک اس طرح بولتی رہی مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی اور اس دوران لاشوں کو دفنا دیا گیا۔

فیصلہ آخر کار وہی ہوا جس خدشے کا اظہار ہانل پہلے ہی کر چکی تھی۔ قاتلوں کو نہ کوئی سزا ہوئی نہ ہی جرمانہ۔ جس طرح مرید کی ہانی چھین لی گئی تھی اس طرح آج ایک مرتبہ پھر ہانل سے اس کا مراد چھین لیا گیا۔ اب ہانل دن رات اپنے بیٹے مراد کی نشانی دوستین کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی۔ گاؤں کے بچے جب بھی ہانل کے گھر آتے ہانل کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کے ساتھ روتے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وڈیرہ نے ہانل کے باپ سے اس کا رشتہ مانگا۔ چند عرصے تک اس کی بات کو ٹالتا رہا مگر وڈیرہ کے اصرار میں شدت آتی گئی۔ ہانل نے کہا کہ مراد کے قاتل کے ساتھ اس کی شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ تو مرنے کے بعد اگلے جہاں میں بھی مراد کی ہانل کی صورت میں اس کے پاس جانا چاہتی ہے۔ لیکن ہانل دیکھ رہی تھی کہ وڈیرہ کس کس طرح سے اس کے باپ اور سسر کو تنگ کر رہا تھا۔ ہانل نے قبرستان میں اس کے سرہانے بیٹھ کر اس سے باتیں کرنا شروع کیں۔ اس نے کہا کہ مراد، وڈیرہ نے تجھے مجھ سے جدا کر دیا لیکن میں اس کے باوجود تمہاری ہوں۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری ہانل تھی اور اس صورت میں تمہارے پاس آؤں گی۔ مراد کی ہانل وڈیرہ کی وڈیرنی بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئی یہ ناممکن ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ایک قاتل دوستین کا باپ کہلائے۔

عید کے دن مراد کے ماں باپ اور دیگر رشتہ دار وڈیرہ کے گھر سے سیدھے ہانل کے گھر آگئے تو دیکھا کہ ہانل گھر کی شہتیر سے لٹک رہی ہے۔ آخر کار اس نے مراد کے ماں باپ کو وڈیرے کے دباؤ سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا تھا۔ اس کی آخری خواہش تھی کہ اس کا بیٹا دوستین مراد کا حوالہ بنے اور یہی اس کی زندگی کا حاصل تھا۔

پشتو افسانے

نُور محمد کاسی

۲۰۳۵ء

سولہ سالہ خوش شکل، دراز قامت، خوبصورت نوجوان اکمل خان اپنی چودہ سالہ نوجوان بہن زرلشتہ کے ساتھ شاخہ نامی گاؤں سے، جو کوئٹہ چمن روڈ سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، پکی سڑک تک پیدل پہنچا۔

انہوں نے یہ آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کیا۔ جب اکمل کچی سڑک سے پکی سڑک کے کنارے پہنچنے کے بعد بس کے انتظار میں کافی وقت گزار چکا تو زرلشتہ زیادہ انتظار سے تنگ آ گئی۔ ایک طرف گردوں میں درد پھر بس کے انتظار کی طویل گھڑیں، اور دوسری طرف بولدک کی طرف سے اڑتی ہوئی سرخ ریت، اتنی سرد ہوا کہ جنوری کے مہینے میں اس وسیع میدان میں ایک لمحہ ٹھہرنا عذاب سے کم نہیں تھا۔

جب جب اس سرد ہوا نے زرلشتہ کے چہرے سے حجاب ہٹایا، تو اکمل نے اس بے پردگی کے ردِعمل میں بار بار آنکھوں ہی آنکھوں میں ناگواری کا اظہار کیا۔

زرلشتہ سمجھتی تھی کہ ان ناگوار نظروں کا مطلب کیا ہے۔ اس لیے وہ فوراً اپنے سرخ سرخ گالوں پر حجاب کھینچ لیتی۔ اور دھیمے دھیمے دل ہی دل میں بڑبڑاتی۔

دو مرتبہ تو اکمل نے اس منظر کو ٹھنڈے دماغ سے برداشت کیا لیکن جب تیسری مرتبہ سرد اور ٹھنڈی ہوا نے زرشتہ کے چہرے سے نقاب ہٹایا تو اس نے اکمل کے خوف سے فوراً پردہ کیا اور خود سے کچھ بڑبڑانے لگی۔ اب تو اکمل کا صبر ختم ہو گیا اور وہ انتہائی غصے میں اپنی بہن سے مخاطب ہوا۔

"یہ تم خود ہی کیا بڑبڑا رہی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ چہرہ چھپاؤ اور تم بڑبڑا رہی ہو۔" زرشتہ بھائی کی اس بات سے خفا ہو کر کہنے لگی، "خود تو تم سکون سے کھڑے ہو۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے میری چادر اوڑھ کر دیکھو سر درد ہو، میں کہتی ہوں جو چہرہ چھپاؤں۔ پھر کیوں پردہ کروں، کس سے پردہ کروں؟ کوئی پتھروں اور جھاڑیوں سے بھی پردہ کرتا ہے۔ اس صحرا میں تمہارے سوا کون ہے جو میرا مٹی اور ریت سے اٹا ہوا چہرہ دیکھے گا۔"

اکمل نے جب بہن کی بات سنی تو ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ سنسان سڑک پر تاحد نگاہ جب اسے کوئی شخص نظر نہ آیا تو شرمندہ ہوا۔ اب اس کی باری تھی کہ وہ خود ہی بڑبڑائے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "قہر درویش برجان درویش۔"

دونوں نے ایک مرتبہ پھر چمن کی طرف سے آنے والی لمبی سڑک کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ بہت دور سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ دونوں طویل انتظار سے اکتا گئے تھے اس لیے زرشتہ اپنے بھائی سے پوچھنے لگی، "یہ کم بخت بس آج کیوں نہیں آ رہی۔ سانپ کی طرح یہ ٹیڑھی سڑک مجھے ڈسنے کو آ رہی ہے۔ آخر کب تک ہم یہاں کھڑے رہیں گے"

"مجھے کیا خبر کہ آج کون سی آفت آ گئی ہے اس سڑک پر تو بسوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ اگر تم چاہو تو اس ٹرک میں کہیں تک سفر کریں؟" اکمل نے بڑی بے زاری کے ساتھ اپنی بہن سے کہا۔ یہ سرد اور چبھتی ہوئی ہوا اور زرشتہ کا یہ کمزور اور بیمار وجود، شاید گاؤں سے یہاں تک کا پیدل آنا، اور طویل انتظار نے اس سے کچھ کہنے کی سکت بھی چھین لی تھی جس کی وجہ سے زرشتہ بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ پائی ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، اور تھک ہار کر سڑک کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بے زاری سے بیٹھ گئی۔

اکمل حیران تھا کہ آج ٹریفک کیوں بند ہے؟ وہ ایک ٹریکٹر جو دور سے بھینسے کی رفتار سے آ رہا تھا ابھی تک بہت دور تھا۔ اکمل دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ ٹریکٹر پہنچ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وسیع صحرا میں کسی اور طرف کو مڑ نہ جائے۔ ٹریکٹر جب خراماں خراماں ان کے نزدیک پہنچا تو اکمل بہت خوش ہوا جلدی جلدی اپنی چادر لپیٹ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی پگڑی ٹھیک کی اور سڑک کے کنارے پہنچا۔ ٹریکٹر کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ٹریکٹر ڈرائیور نے ابھی تک بریک پر پاؤں نہیں رکھا تھا کہ اکمل بول پڑا۔

"ہم یہاں کافی دیر سے کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں۔ کہیں تک پہنچا دو گے؟ میری بہن سخت بیمار ہے۔ اسے ہسپتال پہنچانا ہے۔" ٹریکٹر ڈرائیور نے شور کی وجہ سے اکمل کی بات نہ سنی اور ہاتھ کے اشارے سے اکمل سے "پوچھا کیا کہہ رہے ہو بھائی؟"

اکمل نے پھر اس سے کہا "بھائی ہمیں کہیں تک پہنچا دو گے۔" ڈرائیور نے اشارے سے کہا کہ پیچھے ٹرالی میں بیٹھ جاؤ۔ اکمل نے جلدی سے زرشتہ سے کہا "جلدی کرو ورنہ معلوم نہیں آگے کیا ہوگا۔" وہ دونوں بڑی مشکل سے ٹرالی میں سوار ہوئے۔ زرشتہ جس وقت ٹرالی میں سوار ہونے لگی تھی تو تب پیر پھسل گیا تھا۔ اکمل نے پھر اسے ناگوار آنکھوں سے دیکھا زرشتہ نے اکمل کی ناگوار نظروں کا جواب بڑبڑانے سے دیا۔

"خوار ہو ... تم مردوں ... عورت بے چاری اگر آسمان تک پہنچ جائے پھر بھی حجاب میں ہوگی۔ چاہے ٹریکٹر پر تیزی سے چڑھنے میں بے چاری کے دانت نکلیں یا پیر ٹوٹ جائیں، مردوں کو کوئی پرواہ نہیں۔"

اکمل نے ٹریکٹر کے شور کی وجہ سے زرشتہ کی بات پوری نہیں سنی اور پھر اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ایک اجنبی ڈرائیور کے سامنے وہ اپنی بہن سے بحث کرے۔ اس لیے اس نے سنی ان سنی کر دی اور ٹرالی کے اوپر چڑھ کر ڈرائیور کے نزدیک ہوتے ہوئے اس سے پوچھا، "اے بھائی یہ آج کون سی آفت آ گئی ہے کہ نہ کوئی بس نہ کوئی گاڑی ..." ڈرائیور نے جواب دیا کہ "تمہیں نہیں معلوم؟" اکمل نے اشارے سے کہا نہیں۔ مجھے کچھ نہیں پتہ ..."

''آج پورے علاقے میں پولیس کے ناروا سلوک کے خلاف احتجاجاً ٹرانسپورٹروں نے ہڑتال کی ہے۔'' اکمل نے پوچھا ''اچھا تو تم نے ہڑتال کیوں نہیں کی؟''

ڈرائیور نے ٹریکٹر چلاتے ہوئے ایک مرتبہ ٹوٹی پھوٹی سڑک کو دیکھا پھر اکمل کو حیرت اور غور سے دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ اس نوجوان کو کیا جواب دوں۔ بس صرف اتنا کہا ''اے بھائی خان کے باغات کے بند (ڈیم) پانی بہا کے لے گئے ہیں۔ فون کیا ہے کہ ضرور پہنچوں۔ اس لیے جا رہا ہوں۔ خدا کا غضب اس سردی کے موسم میں اتنے زبردست سیلاب کا پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔'' زرلشتہ جو ٹریکٹر کے پیچھے ٹرالی میں بیٹھی کافی دیر سے ناترس ٹھنڈی ہوا اور ٹریکٹر ٹرالی کے جھٹکوں کا مقابلہ کر رہی تھی اب اس پر سردی اور گردوں کے درد کی وجہ سے کپکپی طاری ہوگئی تھی چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ ایک طرف سردی سے دانت بج رہے تھے اور دوسری طرف زیادہ جھٹکوں کی وجہ سے گردوں میں سخت درد ہونے لگا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کمر دبا رکھی تھی۔ ناک اور گال اتنے سرخ ہو چکے تھے۔ لگتا تھا کہ خون ٹپک رہا ہے۔ زیادہ درد کی وجہ سے وہ اب اپنے ہوش وحواس میں نہ تھی۔ اس کا حجاب ہٹ چکا تھا۔ چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اچانک جب اکمل کی نظر پڑی تو انتہائی غصے میں اپنی بہن سے مخاطب ہوا۔

''بے شرم، ہزار مرتبہ تم سے کہا ہے کہ چہرا حجاب میں رکھو اچھی طرح پردہ کر لیا کرو۔ اب اگر اس اجنبی شخص نے تجھے دیکھ لیا تو کیا کہے گا؟''

زرلشتہ نے کراہتے ہوئے اپنے بھائی کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ بھائی جو ڈرائیور کے پیچھے ٹرالی میں کھڑا تھا آہستہ آہستہ نیچے اترا اور قریب آیا۔ جب اس کی نظر زرلشتہ کے زرد چہرے اور خشک ہونٹوں پر پڑی تو حیران رہ گیا اور گھبرا کر جلدی سے اپنی بہن سے پوچھا۔

''کیا بات ہے کیوں کانپ رہی ہو''۔۔

''تم خاک میرا علاج کرو گے۔ ٹریکٹر کے اچھلنے کی وجہ سے اب میرے گردے پھٹ رہے ہیں '' درد سے کراہتے ہوئے اس نے بھائی سے کہا۔''اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی ٹریکٹر روک دو میں اترنا چاہتی ہوں '' اکمل پہلے تو حیران ہوا کہ میں کیا کروں۔ پھر

کچھ سوچنے کے بعد اپنی بہن کو تسلی دی بس ذرا سا صبر کرو، اب ہم کوژک کی چوٹی تک پہنچ گئے ہیں۔ہم بہت جلد قلعہ عبداللہ پہنچنے والے ہیں۔ زرشتہ پھر درد سے کراہنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اکمل سے مزید بات کرنا فضول ہے کیونکہ وہ بھی مجبور تھا۔صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب زرشتہ کو اس پرانے ٹریکٹر اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کے جھٹکوں کا نا معلوم وقت تک سامنا کرنا تھا۔شام کی سیاہی پھیلتے ہی وہ قلعہ عبداللہ پہنچے۔ٹریکٹر کا ڈرائیور جب چمن کوئٹہ روڈ پر سیدھے ہاتھ کو کچی سڑک پر اترا تو اکمل کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا .....

اکمل جب نزدیک گیا تو ڈرائیور نے کہا، ''نوجوان، میں اس راستے خان کے گھر جا رہا ہوں رات ہونے والی ہے۔کوئٹہ کی طرف کوئی ٹریفک نہیں جا رہی۔ ہوٹل والے نے بتایا ہے کہ آگے راستے میں سید حمید کے پل پر پانی چڑھ آیا ہے۔ اس لیے صبح تک کوئی راستہ نہیں۔ اگر میری مانو تو میرے ساتھ چلو۔ ہمارے خان اچھے پشتون ہیں آپ اور بہن وہاں رات گزار لینا۔'' اکمل نے اپنی بہن سے بھی مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور خود فیصلہ کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا، اچھا تو چلو

اب اس اندھیری رات میں وہ اور کہاں جاتے نوجوان بہن کو کہاں لے جاتا۔ ہوٹل میں جوان بہن کے ساتھ ٹھہرنا بھی ایک بہت بڑا طعنہ تھا۔ اس لیے اس نے ڈرائیور کو خان کے گھر کی طرف جانے کا اشارہ کیا اس کے ساتھ ہی ٹریکٹر پکی سڑک سے کچے راستے پر آگے بڑھا اور چند لمحے بعد ٹریکٹر سیدھا خان کے حُجرے کے سامنے آ کر رک گیا

خان کا نوجوان، خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیٹا نئی کلاشنکوف ہاتھ میں لیے حُجرے کے بڑے دروازے میں اپنے دوستوں سمیت کھڑا تھا۔ اس نے بڑی محبت کے ساتھ مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ اس کی بہن کو گھر کے اندر لے جائے

رات کو اکمل نے خان کے بیٹے کو تمام حالات سے آگاہ کیا کہ وہ بہن کو گردوں کے علاج کے لیے شاخہ گاؤں سے کوئٹہ لے جا رہے ہیں۔ یہ تیس کلومیٹر کا سفر انہوں نے پورے دن میں طے کیا۔سردی اور ٹریکٹر کی وجہ سے بہن کی بیماری میں اور اضافہ ہوا۔کل اللہ جانے کہ وہ

پل ٹریفک کے لیے کھل جائے یا نہیں۔ اگر کل راستہ نہیں کھلا تو مجبوراً گاؤں واپس جانا پڑے گا۔ مرنا ہے تو مر جائے اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں

خان کے بیٹے نے کہا، آپ لوگوں کے اس مسئلے پر بعد میں غور کریں گے۔ اس وقت ڈش پر بہت ضروری پروگرام آ رہا ہے۔ میں پہلے وہ دیکھنا چاہتا ہوں اے خیرو، ذرا بی بی سی یا سی این این لگاؤ۔ نو بجنے والے ہیں۔ آج پندرہ جنوری ہے۔ دنیا کے ڈھائی سو خوش نصیب انسان ٹھیک نو بجے چاند پر قدم رکھنے والے ہیں۔ جلدی کرو یہ منظر دیکھنا بہت ضروری ہے" چینل لگا دیا گیا۔ واقعی مصنوعی سیارچہ تھا، آسمان تھا۔ سیارہ آہستہ آہستہ چاند کی زمین پر اترا۔

نیچے زمین پر ناسا کے کنٹرول روم پر انسانوں نے اپنی کامیابی پر تالیاں بجائیں

خان نے بھی اپنے ساتھیوں سمیت تالیاں بجائیں اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی بکنگ کراؤں، ٹکٹ چاہے جتنے کا ہو کوئی پرواہ نہیں۔ میں پورے علاقے میں پہلا شخص ہوں گا جو چاند پر قدم رکھے گا اکمل جو یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ مذاق لگ رہا تھا یا شاید کوئی ویڈیو گیم۔ چاند سے جب مسافروں نے زمین کو دیکھا تو زمین انہیں فٹ بال کی طرح چھوٹی نظر آئی۔ اکمل کو نہ اپنی آنکھوں پر یقین آیا نہ ان لوگوں کی باتوں پر اس لیے اس نے خان سے پوچھا، "چاند تو بہت دور آسمان میں ہے۔ وہاں کوئی شخص کیسے پہنچ سکتا ہے میں تو یہ نہیں مانتا" خان نے اس سے کہا، "اکمل خان، ویسے تو پہلے انسان، جس کا نام نیل آرمسٹرانگ تھا، اس نے ۱۹۶۹ء میں یعنی آج سے ۶۶ سال پہلے چاند پر قدم رکھا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک انسان نے بہت ترقی کی ہے۔ یہ باقاعدہ مسافر ہیں اور یہ باقاعدہ بکی پرواز ہے جس کے ذریعے پوری دنیا کے سیاح اپنی خواہش کے مطابق چاند پر آتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے اسی لیے وہ یہ سب کچھ پوری دنیا میں Live دکھا رہے ہیں"

خان کا بیٹا جتنا بھی اکمل کو سمجھاتا رہا وہ ماننے سے انکار کرتا رہا۔ کوئی اسے کیسے یقین دلا سکتا تھا کیونکہ اس نے اللہ کی اس زمین پر آج بھی تیس کلومیٹر کا فاصلہ پورے دن میں ایک

عذاب کی طرح ٹوٹ گیا تھا، سڑک، ٹوٹا ہوا پل پانی بہا کر لے گیا تھا۔ چچی سے ناروا سلوک کے خلاف ڈاکٹروں کی ہڑتال تھی، وہ اپنی بیمار بہن کو ہسپتال پہنچا نہیں پا رہا تھا۔ اگر خان کے باغ کے بند سیلاب نہ لے جاتا تو شاید یہ پرابلم بھی نہ تھا۔

وہ پریشانی میں سوچتا رہا۔ اسے چاند، خان اور سیٹلائٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اور صرف اپنی بہن زرشتہ کے بارے میں فکرمند تھا۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوگی۔ خان کے گھر کی خواتین اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہوں گی؟ معلوم نہیں کہ اس کے گردوں کا علاج کبھی ہوگا بھی کہ نہیں۔ وہ آخر کب تک وہاں پہنچ پائیں گے۔

آخر کب تک؟

شاید کوئٹہ چاند سے بھی زیادہ فاصلے پر واقع ہے؟

اسی لیے تو ان کی دسترس سے دور ہے بہت دور۔ بہت دور۔ چاند سے بھی زیادہ دور۔

نصیب اللہ سیماب

آب حیات

''میں امر ہونا چاہتا ہوں اور موت کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کروں گا'' وہ اکثر اپنی دلی خواہش کا اظہار کرتا۔

میں اس کی بے سرو پا باتوں کو ٹھٹھے میں اڑاتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں جواب دیتا:

''اگر تم لافانی زندگی کے آرزومند ہو تو آب حیات ڈھونڈو۔ اس کو پی کر ہی تم امر ہو سکتے ہو۔ ورنہ موت تو ایک اٹل حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔'' یہ سن کر اس کے چہرے پر معصومانہ مسکراہٹ نمودار ہوتی اور بڑے اشتیاق سے پوچھتا:

''یار اس چشمہ حیوان کا کوئی اتہ پتہ تو چلے۔ میں واقعی اس کا متلاشی ہوں تاکہ چند گھونٹ پی کر موت کے خوف سے نجات پا سکوں۔''

میں اس کی لافانی زندگی کی خواہش اور موت کے خوف کے پس منظر میں اس کے ماضی میں جھانکتا تو وہ بے قصور نظر آتا۔ دراصل وہ اپنے والدین کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کے گھر میں موت نے خیمے گاڑ لیے تھے۔ سارے بہن بھائی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی لقمہ اجل بن جاتے۔ اس کی کوکھ جلی ماں اس غم سے نیم پاگل ہو چکی تھی۔ وہ اپنے

اکلوتے بیٹے کو بانہوں میں یوں زور سے سمیٹ لیتی جیسے موت اس کے بھی در پے ہو اور اسے چھین کر لے جانا چاہتا ہو۔ وہ گلوگیر لہجے میں کہتی:

''بیٹا! تم کہیں نہ جانا۔ اگر تم بھی بچھڑ گئے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔''

اس کے لاشعور پر اپنی ماں کے چہرے پر پڑے آنسوؤں کا گہرا اثر موجود تھا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں اور بے اختیار خود کلامی نے اس کے دل و دماغ کو انتہائی متاثر کیا تھا۔ تبھی وہ ماں کی اشک شوئی کی خاطر لافانی زندگی کے خواب دیکھتا رہتا اور ہر وقت موت سے خائف رہتا۔

وہ میرا ہم مکتب اور ہمسایہ تھا۔ ہم دونوں کی بچپن سے گہری دوستی تھی۔ وہ اپنی تنہائی کی عادت اور ماں کی کڑی نگرانی کے باعث گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ میں روزانہ ان کے گھر جاتا اور ہم مل کر گھنٹوں کھیلتے رہتے۔ گھر کا آنگن ہر شام ہماری باتوں اور قہقہوں کے شور سے گونجتا۔ اس کی ماں مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی تھی۔ کبھی کبھار ہمارے ساتھ مل کر بچوں کی طرح کھیلتی۔

یوں وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور ہم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دوست کے دل میں ابدی زندگی کی آرزو بھی بڑھتی چلی گئی اور آخرکار جنون کی شکل اختیار کر لی۔ اس موضوع پر اس کی سوئی ہر وقت اٹکی رہتی جس سے مجھے انتہائی کوفت ہوتی وہ جب بولنا شروع کرتا تو لہجہ میں بھرپور اعتماد اور چہرے پر کرختگی کے آثار نمودار ہو جاتے۔ اس کے انداز گفتگو سے میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہوتی۔

وہ ایک ایسے سپنے کا تعاقب کر رہا تھا جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا جب کہ اس نے اسے مقصد حیات بنا لیا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ لیکن دوسری طرف اس کے مضبوط ارادے کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اگر کسی مقصد کی جستجو میں اخلاص اور صداقت کی چاشنی شامل ہو تو آدمی منزل مقصود تک ضرور پہنچ سکتا ہے۔

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر چلا گیا۔ ان دنوں میں پڑھائی اور شہر کی رنگینیوں میں ایسا کھویا کہ اپنے گھر اور پرانے دوستوں سے رابطہ تقریباً

کٹ کر رہ گیا۔ کبھی کبھار میرے دوست کا کوئی خط ملتا۔ جس میں ہر بات زندگی سے شروع ہوتی اور موت پر ختم ہوتی۔ پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پوری دنیا کو جلا دینا چاہتا ہو۔ اس کے عجیب و غریب خیالات کے بارے میں سوچتے ہوئے میں پریشان ہو جاتا لیکن ان کی سچائی کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔

چھٹیوں کے دوران جب میں گھر لوٹا تو پتہ چلا کہ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اگلے دن اس کی ماں کی مزاج پرسی کرنے گیا تو وہ ایک ایسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح لگی جس کے بچے کو شیر اٹھا لے گیا ہو، اور وہ بے بسی سے چاروں طرف اس کی تلاش میں بھٹک رہی ہو۔ اس کی ترستی آنکھوں میں بے شمار سوال تیر رہے تھے۔ آس بھری نگاہیں میرے چہرے پر یوں گڑی تھیں کہ شاید میں اپنے دوست کے بارے میں کوئی خیر خبر لایا ہوں۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اپنا حال دل ڈبڈباتی آنکھوں سے بیان کیا۔ اس کی خوبصورت بوڑھی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی چھوٹ پڑی۔ خاموشی سے میری کلائی پکڑی اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ الماری سے ایک خالی لفافہ نکال کر مجھے تھمایا۔ لفافے کے اندر خط پڑا تھا جو اس نے اپنی ماں کے نام لکھا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو سفید کاغذ پر کالے حرفوں کے بیچ میں میرے دوست کا معصوم چہرہ ابھرا اور شہاب ثاقب کی طرح ذہن کے دھندلے آسمان پر بکھر کر معدوم ہو گیا۔ اس کی ماں مضطرب نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر خط پڑھنے لگا۔

"پیاری ماں!

میں موت کے خوف سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں جو مجھے ابدی زندگی بخش دے گا۔ اس کے بعد میرا نام کبھی بھی مُردوں کی فہرست میں نہ آئے گا کیونکہ میں ان میں شمار ہونا نہیں چاہتا   میں امر ہونا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔

زندگی بھر میری یہ خواہش رہی ہے کہ میں لافانی بن جاؤں۔ تمہارے حسین چہرے پر سدا

رواں آنسوؤں کی قسم، میں تمہاری خواہش مرحال میں پوراکروں گا۔

فقط تمہاری دعاؤں کا محتاج، بیٹا

خط پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس کے بارے میں کیا کہوں؟ میرا دوست ایک ایسے سراب کے تعاقب میں سرگرداں تھا جس کا حاصل سوائے آبلہ پائی کے اور کچھ نہ تھا۔ میرے پاس اس کی ماں کی جھوٹی تسلی دینے کو الفاظ نہیں مل رہے تھے سو خاموش اور غم زدہ واپس اپنے گھر لوٹا۔

جس دن میری چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں شہر جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا تو صبح سویرے میرے دوست کے گھر سے خلاف معمول شور وغوغا بلند ہوا۔ میں گھبرا کر احوال دریافت کرنے دوڑا۔ دروازے سے جیسے ہی اندر داخل ہوا تو صحن میں ایک تابوت دکھائی دیا۔

میرے دوست کی ماں اس کی سرہانے کھڑی تھی۔ ان کی خشک آنکھیں اور پُر اعتماد انداز دیکھ کر میں حیرت سے چکرا گیا۔ میں ان کے قریب پہنچا تو ایک اجنبی کو تاسف سے کہتے ہوئے سنا کہ ''آپ کے بیٹے نے بڈگام میں مردانہ وار لڑتے ہوئے بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ وہ انتہائی دلیری سے لڑا اور دشمن کی سب گولیاں اپنے سینے پر کھائیں۔''

یہ سن کر اس کی ماں کے منہ سے اف تک نہ نکلی۔ انہوں نے خلاف توقع فخر سے اپنا سینہ پھیلایا اور پراعتماد لہجہ میں بولی:

'' خدا نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ میرا بیٹا امر ہو گیا شہید کبھی نہیں مرتے اس نے ابدی زندگی پالی ! میرا بیٹا زندہ ہے میرا بیٹا نہیں مرا میرے بیٹے نے موت کو شکست دے دی!

میرا بیٹا زندہ ہے!''

فاروق سرور

پرندہ

بہت دنوں سے کلاشنکوف اور راکٹ لانچر چیخ رہے ہیں، جیسے دوزخ میں موجود گناہ گاروں کو دیکھ کر خوفناک اژدہے آگ برسا رہے ہوں۔ جنگ ہو رہی ہے۔ یہ جنگ ان دو بستیوں کے درمیان ہے جن کے مکینوں کے دلوں میں ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے محبت اور اخوت کے سفید گلاب کھلتے تھے۔ لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے ان دونوں بستیوں کو کسی بدطینت اور حاسد جادوگرنی کی بددعا لگ گئی ہو۔ اسی لیے تو دونوں طرف سے ایک دوسرے پر گولے برسائے جا رہے ہیں۔ دونوں بستیوں کی مائیں، بہنیں ہر وقت اپنے اپنے بزرگوں کے مزاروں پر جاتی ہیں اور وہاں گڑگڑا کر دعائیں مانگتی ہیں کہ جنگ ختم ہو۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان بزرگوں کی روحیں بھی ان بستیوں کے لوگوں سے ناراض ہوں۔ اسی لیے تو جنگ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ بہت سے خوبصورت گھر جہاں زندگی ہر وقت شرارتی بچوں کی طرح کھیلتی کودتی تھی، اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ چاروں طرف بارود کی بو یوں پھیلی ہوئی ہے جیسے وہ کوئی چڑیل ہو، رقص کر رہی ہو اور ان بربادیوں پر جشن منا رہی ہو۔ دونوں بستیوں میں جہاں رات کے وقت دف پر دوشیزائیں رومان پرور گیت گاتی تھیں، اب اندھیرے میں سرخ

انگارے برس رہے ہیں۔ اس وقت تو لوگ زیادہ تر صرف جاگتے ہیں جب کسی گھر سے کسی کے
زخمی ہونے یا مرنے پر اس کے بچوں اور عورتوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

یہ جنگ کیسے شروع ہوئی، کیوں کر شروع ہوئی اور وہ اجنبی چیونٹیاں کہاں سے آئیں
جنہوں نے یہاں بسیرا کر کے اس امن کی فاختہ کو مار دیا۔ اس بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں
جانتا۔ البتہ بعض سیانوں کا کہنا ہے کہ اس جنگ کے شروع کرنے میں ارد گرد کی بستیوں کا بڑا
ہاتھ ہے کیونکہ ان کا امن اسی میں تھا اور شاید بہت برتری کی بھی تھی۔ اسی لیے تو یہ حاسد یہ
بستیاں چوری چھپے ان دو بستیوں کو گولہ بارود کے تحفے میں دے رہی ہیں اور یہاں لگی آگ کے
شعلوں کو مزید بھڑکا رہی ہیں۔

دونوں بستیوں کے لوگ اب جنگ سے بیزار ہیں۔ لگتا ہے انہیں بارود کی مخصوص بو
سے۔ اچھے نہیں لگتے انہیں ان لوگوں کے قافلے جو خوف کی وجہ سے اپنی اپنی بستی چھوڑ کر
جا رہے ہیں۔ زہر لگتی ہے انہیں توپوں کی گھن گرج اور وہ دھواں جو جگہ جگہ سے اٹھ رہا ہے۔ ہر
ایک کا جی چاہتا ہے کہ جنگ رک جائے۔ لیکن اب جنگجو قبیلے اور اس جنگ میں ملوث
پراسرار سائے، کوئی بھی تو ان کے قابو میں نہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جنگ کب اور کیسے
ختم ہوگی؟ بس خوف کا دیو ہے جو پاگل اونٹ کی طرح بلبلا رہا ہے اور لوگوں کے دلوں کو زیادہ
شدت سے مسل رہا ہے۔

اچانک ان برسرپیکار بستیوں میں سے ایک بستی کے اندر ایک پرندے کی آواز گونجتی
ہے۔ یہ آواز اتنی میٹھی ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے معمولات بھول کر اس کی طرف متوجہ
ہو جاتے ہیں۔ بستی کی وہ عورتیں جو زخمیوں اور معذوروں کی مرہم پٹی میں لگی ہیں، بچے جو گھروں
کے بند کمروں میں محبوس کھیل رہے ہیں اور مرد جو مورچوں میں بیٹھے فائرنگ میں مصروف ہیں،
سب کے سب اس آواز کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ پرندے کی آواز میں غضب کا جادو ہے جو
ہر ایک کو بت بنا دیتا ہے، ایسا بت جو صرف سانس لے رہا ہے۔ پرندے کی آواز سن رہا ہے اور
کوئی حرکت نہ ہو اس میں۔

اس عالم میں جونہی اس بستی سے، جو جنوبی بستی کہلاتی ہے، لڑائی رک جاتی ہے تو دشمن بستی کے لوگ حیران ہو جاتے ہیں کہ جنوبی بستی سے آگ کا برسنا کیوں رکا؟ کیونکہ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ پھر وہ سب خوش ہو جاتے ہیں۔ شاید مخالف بستی نے جنگ میں ہار مان لی ہے۔ اس پر وہاں ایک جشن کا سا سماں بندھ جاتا ہے اور لوگ جوشِ مسرت میں لمحہ بھر کے لیے اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر رقص کرنے لگ جاتے ہیں۔

جونہی پرندے کی آواز بند ہو جاتی ہے، جنوبی بستی کے بت بنے لوگ یوں حرکت میں آ جاتے ہیں جیسے سحر کا جادو ٹوٹ گیا ہو اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے ہوں۔ سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں کہ یہ کیسا پرندہ تھا، کدھر سے آیا اور کس جگہ بیٹھ کر بولا اور اس کی آواز میں ایسا جادو کیوں تھا کہ سب کو اس نے سحر زدہ کر دیا؟ اور تو اور اس کی آواز کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے لڑائی بھی رکی۔ سب اس راز کو معلوم کرنے کی جستجو میں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر بستی کے ملک کی حویلی میں آتے ہیں، کہ اسی اثناء میں بستی کے مورچہ بند نوجوان دشمن بستی پر دوبارہ فائرنگ اور گولہ باری شروع کر دیتے ہیں اور یوں کچھ دیر کے لیے بند جنگ دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔

اچانک دشمن بستی سے آگ کا برسنا رک جاتا ہے۔ یہ عمل جنوبی بستی کے لوگوں کو حیران کر دیتا ہے اس سے پہلے کہ وہ اس فائر بندی کی وجہ جانیں، بستی کے ملک کا گیارہ سالہ لڑکا بھاگتا ہوا اپنے گھر آتا ہے اور وہاں جمع لوگوں کو بتاتا ہے، "وہ پرندہ جو کچھ دیر کے لیے یہاں آیا تھا اب شمالی گاؤں میں چہک رہا ہے۔ شاید وہاں کے لوگ بھی اس پرندے کی آواز کے جادو میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اب لڑ نہیں رہے، میں نے خود اپنی بستی کے باہر اس پرندے کی آواز سنی جو دشمن گاؤں سے آ رہی ہے۔"

کیا لڑکے کی بات سچ ہے؟ کیا واقعی وہ انوکھا پرندہ اب دشمنوں کی بستی میں بول رہا ہے؟ اس بات کا کوئی بھی یقین نہیں کرتا لیکن پھر جب چند بڑے، بوڑھے اور لڑکے کا باپ اس بات کی تصدیق کے لیے بہت احتیاط کے ساتھ گاؤں سے باہر آتے ہیں تو واقعی دوسرے گاؤں

سے پرندے کی آواز آرہی ہے۔

لیکن جونہی وہاں سے پرندے کی آواز بند ہوتی ہے فوراً ہی دوبارہ کلاشنکوف اور کلاکوف کی فائرنگ شروع ہوجاتی ہے اس کے ساتھ تصدیق کرنے والے دو افراد فوراً کھائیوں میں چھپ جاتے ہیں اور چند گولیاں بھی ان کے سروں سے سنسناتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔

باوجودیکہ لڑائی ہورہی ہے پھر بھی بستی کے لوگ ملک کے گھر میں جمع ہیں اور ابھی تک ان سب کا موضوع وہ پرندہ ہے۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ اس پرندے کی آواز میں آخر ایسی کیا بات تھی کہ جب ہم اسے سن رہے تھے تو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور نفرت کے کالے کوے وہاں سے اڑ گئے تھے۔ کیا یہ پرندہ کوئی فرشتہ تو نہیں تھا جو ہمارے سیاہ دلوں میں پیار اور آشتی کا نور ڈالنے آیا تھا۔

ملک کا چھوٹا بیٹا، جس نے شمالی گاؤں سے پرندے کی آواز سنی تھی کچھ زیادہ ہی بے چین اور متجسس ہے وہ اپنی ماں، بہنوں اور دوسری عورتوں سے پوچھ رہا ہے کہ جب ہر ایک کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پرندہ اس کے گھر میں بول رہا ہو تو وہ کسی کو نظر کیوں نہیں آیا۔ ہمیں اس پرندے کو دیکھنا چاہیے تھا کہ اس کے پر کیسے ہیں، آنکھیں اور چونچ کیسی ہے اور وہ کتنا پیارا اور خوبصورت ہے۔

اچانک جنوبی بستی میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پرندہ دوبارہ بول پڑتا ہے۔ پرندے کی آواز سن کر لوگ خوشی سے چیخ اٹھتے ہیں، "پرندہ آگیا، پرندہ آگیا۔"

پرندے کی یہ آواز جب مورچوں میں بیٹھے ان جنگجو نوجوانوں کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ بھی یوں فائرنگ بند کر دیتے ہیں جیسے کوئی ان کے ہاتھوں کی انگلیوں شل کر دے۔

پرندے کی یہ چہکار کیا ہے، جیسے بہت سی پریاں مل کر بانسریاں بیک آواز بہت خوبصورتی سے بجا رہی ہوں۔

جو شخص بھی یہ آواز سنتا ہے وہ چاروں طرف دیکھتا ہے، کہ آخر یہ آواز اتنے قریب سے

کہاں سے آ رہی ہے لیکن اسے پرندہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔

اس عالم میں ملک کا چھوٹا بیٹا اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ وہ گلی گلی، کوچے کوچے گھومتا ہے ایک ایک گھر میں جھانکتا ہے، ہر درخت کی شاخوں کو غور سے دیکھتا ہے کہ شاید اسے پرندہ نظر آ جائے لیکن پرندہ کہیں بھی اسے نہیں ملتا۔ وہ اسی شوق میں مختلف گھروں کی چھتوں پر بھی چڑھتا ہے کہ ہو سکتا ہے پرندہ اسے یہاں کہیں مل جائے، لیکن پرندہ ان چھتوں پر بھی نہیں ہوتا۔

پرندہ اپنی میٹھی آواز میں مسلسل چہچہاتا جا رہا ہے۔ بستی کے تمام لوگ آنکھیں بند کیے اس کی آواز پر مجذوبوں کی طرح جھوم رہے ہیں۔ کبھی کبھار تو یہ گمان بھی ہوتا ہے جیسے کوہ قاف سے کوئی موسیقار آیا ہو اور اپنے بربط پر کوئی خوبصورت نغمہ چھیڑ رہا ہو۔ پرندے کی شیریں آواز کی جادوگری نے تمام بستی والوں کو اپنے جال میں جکڑ لیا ہے اور غضب تو یہ کہ کوئی بھی اس جال سے نکلنا نہیں چاہ رہا۔ جنگجو نوجوانوں کی تو حالت ہی کچھ اور ہے۔ وہ تمام اپنے مورچوں کے اندر کھڑے اس حسین آسمانی گیت پر ناچ رہے ہیں۔ لیکن جیسے ہی پرندے کی آواز بند ہوجاتی ہے دوبارہ اس بستی سے آگ کا برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

اب دونوں بستیوں کا ایک نئی صورت حال سے سامنا ہوتا ہے، پرندہ جہاں جہاں جاتا ہے وہاں لوگ لڑنا بند کر دیتے ہیں۔ یوں جیسے ہی پرندے کی آمد و رفت تیز ہو رہی ہے لڑائی میں بھی کمی آ رہی ہے۔ جنگجو نوجوانوں کو اس وقت ایک عجیب سی ذہنی کیفیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جب وہ پرندے کی آواز سنتے ہیں تو انہیں جنگ سے نفرت ہو جاتی ہے لیکن جیسے ہی یہ آواز ختم ہو جاتی ہے دوبارہ پرانی نفرت کے کانٹے ان کے دلوں میں اگ آتے ہیں، اور وہ دوبارہ دشمن پر وار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ملک کے گیارہ سالہ بیٹے کو اس کے گھر والوں نے گھر کے اندر محبوس کر دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ باہر جائے، پرندے کو تلاش کرے اور اسے پکڑے تاکہ پھر پرندہ مسلسل بولے اور اس کے اڑ جانے کا ڈر نہ ہو اور یوں لڑائی کا مکمل خاتمہ ہو۔ لیکن اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کا کہنا ہے کہ باہر خطرہ ہے، دشمن کی گولیاں برس رہی ہیں اور کوئی بھی گولی اس کی جان لے سکتی

ہے۔ وہ لڑکا چیختا ہے، روتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی بات نہیں مانتا۔ آخر وہ گھر والوں سے چھپ کر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سے گھر سے باہر آجاتا ہے۔

لڑکا جلدی میں جوتے پہننا بھی بھول گیا۔ دونوں بستیوں کو چاروں طرف سے پہاڑوں نے یوں ڈھانپ رکھا ہے جیسے دو بچے اپنی ماں کی گود میں ہوں۔ اب لڑکا بستی سے عقب میں پہاڑوں کے دامن میں پرندے کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے کانوں میں پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ مسلسل گونج رہی ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح بڑے بڑے پتھروں کی طرف بھاگ رہا ہے کہ پرندہ یہیں کہیں ہوگا لیکن پرندہ اسے مل نہیں رہا۔ اس تلاش میں اس کا ماتھا اور اس کا تمام جسم پسینے سے شرابور ہے اور اس کے پاؤں تیز اور نوکدار پتھروں اور کانٹوں سے زخمی ہیں۔

لڑائی میں اب بہت شدت آچکی ہے۔ لوگ ورد کر رہے ہیں۔ نیک روحوں کو یاد کر رہے ہیں اور ارد گرد خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں لیکن دوسری طرف ملک کے گھر میں ایک ہنگامہ ہے۔ لڑکے کی ماں اور بہنیں اس کی گمشدگی پر رو رہی ہیں۔ لڑکے کو تمام بستی میں تلاش کیا گیا ہے لیکن اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ ملک اور دوسرے لوگ ان عورتوں کو سمجھا رہے ہیں کہ لڑکا یہیں کہیں ہوگا۔ مل جائے گا۔ لیکن ان عورتوں کا کہنا ہے کہ بچے کو ضرور کہیں گولی لگی ہے اور اس کی لاش کسی کھائی میں پڑی ہوگی۔

لڑکے نے پہاڑوں کے دامن میں اپنی تلاش کو جاری رکھا ہے۔ یہاں بھی بستی کے گلی، کوچوں کی طرح بہت سے جانوروں کی لاشیں پڑی ہے جو جنگ کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ اچانک ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ سے اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دیتی ہے وہ خوش ہو جاتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ ضرور پرندہ ہوگا لیکن پتھر کے پیچھے سے ایک بوڑھا نمودار ہوتا ہے۔ یہ اجنبی بوڑھا بالکل ان فرشتوں کی طرح ہے جس کی کہانیاں اس لڑکے نے اپنی ماں اور بہنوں سے سن رکھی ہوتی ہیں۔

بوڑھے کی جہاں سفید لمبی داڑھی، سفید لمبے بال اور سفید لباس ہے وہاں اس کے جسم سے سفید روشنی بھی پھوٹ رہی ہے اور وہ مجسم نور ہے۔ بوڑھے کے اس حلیے سے لڑکا گھبرا جاتا ہے۔

''مت ڈرو۔ میرے پیارے بیٹے یہاں آؤ۔'' بوڑھا پیار سے اسے کہتا ہے۔

لڑکا سہما سہما سا اس کی طرف بڑھتا ہے۔ بوڑھا اس کے ماتھے کو چومتا ہے۔'' تم جنوبی گاؤں کے رہنے والے ہو نا، میں تمہیں جانتا ہوں۔''

لڑکا بوڑھے کو حیرت سے دیکھتا ہے۔

''تم پرندے کی تلاش میں ہو تاکہ تمہاری بستی میں ہمیشہ کے لیے امن آجائے۔'' لڑکے کی حیرت مزید بڑھ جاتی ہے

''آپ کو ان سب باتوں کا کیسے پتہ؟''

''میرا نام ہیت ہے''۔ بوڑھا ہنستا ہے۔'' شمالی اور جنوبی دونوں بستیوں کے لوگ میری اولاد ہیں۔ میں نے تو ان کی سلامتی کے لیے اللہ پاک سے بہت ساری دعائیں مانگی تھیں لیکن نہ جانے کیوں یہ دوسروں کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے آپ کو ختم کر رہے ہیں۔''

''آپ ہمارے دادا ہیں لیکن میں نے تو کبھی بھی آپ کے متعلق نہیں سنا ہے۔'' لڑکا بوڑھے کو غور سے دیکھتا ہے۔'' آپ میرے ساتھ گاؤں کیوں نہیں چلتے؟''

''گاؤں تو میں اس وقت آؤں گا جب میں تمہیں پرندہ دوں گا۔'' بوڑھا لڑکے کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتا ہے۔

''تو کیا وہ پرندہ آپ کا ہے جو ہماری بستی میں آتا ہے اور گاتا ہے؟'' لڑکا خوش ہو جاتا ہے۔

''بالکل'' بوڑھا مسکراتا ہے'' اسے میں ہی بھیجتا ہوں میں تو چاہتا ہوں کہ جنگ رک جائے لیکن کم بخت نہیں رکتی۔ آؤ میں تمہیں سامنے پہاڑ میں واقع اپنے اس غار میں لے جاؤں جہاں میں نے اس پرندے کو چھپا رکھا ہے۔''

''چلیں'' لڑکا خوش خوش اس اجنبی بوڑھے کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے۔

ملک کے گھر میں اس وقت کہرام مچا ہوا ہے اور عورتیں بین کر رہی ہیں اچانک بستی کا ایک شخص بھاگتا ہوا باہر سے آتا ہے اور یہ خوش خبری لاتا ہے کہ لڑکا زندہ ہے۔

''کہاں ہے؟'' لڑکے کی ماں، تم چھوڑ کر اس کی طرف بھاگتی ہوئی آتی ہے۔

''پہاڑوں کے دامن میں!''

خوشی کی ایک لہر دلوں میں دوڑ جاتی ہیں۔

''تو اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟'' تمام لوگ بیک زبان اس شخص سے پوچھتے ہیں۔ ''میں ڈر کی وجہ سے اسے ساتھ نہیں لا سکا''

''کیوں کس ڈر کی وجہ سے؟'' لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔

''وہ ایک ایسے بوڑھے کے ساتھ تھا جس کے جسم سے سفید روشنی نکل رہی تھی، اور پھر وہ اجنبی بوڑھا زمین پر کھڑا بھی نہیں تھا بلکہ اڑ رہا تھا۔ بس خوف کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ ہمت کرتا وہ دونوں وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ بوڑھا دشمن بستی کی طرف سے بھیجا گیا کوئی جادوگر تھا۔''

اب ایک نیا خوف پرانے خوف کی جگہ لیتا ہے کہ کہیں دشمن کا جادوگر بچے کو ہلاک نہ کر دے۔ فوراً ہی چند مردوں کی ایک ٹولی بنتی ہے جو پہاڑوں کے دامن کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

اب تمام بستی میں جہاں لڑکے کی سلامتی کی دعائیں مانگی جا رہی ہیں وہاں سب کو پرندے کا انتظار بھی ہے، سب چاہتے ہیں کہ وہ پرندے کی خوبصورت آواز دوبارہ سنیں کیونکہ یہی تو وہ آواز ہے جو ان کے زخموں کا مرہم اور ان کے دکھوں کا مداوا ہے۔

لڑکے کو تلاش کرنے والی ٹولی جونہی پہاڑوں کے دامن میں آتی ہے تو اچانک لڑکے کی آواز پر رک جاتی ہے جو دور سے بھاگتا ہوا ان کی طرف آ رہا ہے۔

''بابا.... بابا، مجھے پرندہ مل گیا میں پرندے کو لے آیا ہوں''

لڑکے کو زندہ سلامت دیکھ کر جہاں لڑکے کا باپ اور دوسرے لوگ خوش ہو جاتے ہیں وہاں لڑکے کی اس انوکھی بات پر سب حیران بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ لڑکا خالی ہاتھ ہے اور اس کے پاس کوئی پرندہ نہیں ہے۔ سب کو یقین ہو جاتا ہے کہ جادوگر بوڑھے نے لڑکے کو بالآخر پاگل

کر کے ہی بھیجا۔

''لڑکے! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' ملک کو غصہ آتا ہے۔'' کون تھا وہ جادوگر بوڑھا جس کے ساتھ تم تھے۔''

''اسی نے تو مجھے پرندہ دیا۔ وہ ہم سب کا دادا ہے، بیٹ نیلہ''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے'' لڑکے کے باپ کا غصہ بڑھ جاتا ہے۔'' ہم کسی بیٹ ویٹ کو نہیں جانتے، ورنہ ہی ہمارے دادا کا نام بیٹ تھا اور پھر تم تو خالی ہاتھ ہو۔ جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ کہاں ہے پرندہ؟''

باپ کے غصے سے لڑکا گھبرا جاتا ہے لیکن اس ٹولی میں ایک سیانا شخص بھی ہے جو لڑکے کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔

''ہاں، ہاں بولو بیٹا! کہاں ہے پرندہ؟''

''اسے میں نے اپنے گھر بھیجا ہے۔ کیا آپ لوگوں نے اسے رستے میں نہیں دیکھا؟ وہ وہاں پہنچ گیا ہوگا اور اب ہمیشہ ہمارے پاس رہے گا'' لڑکا معصومیت سے کہتا ہے۔

''پاگل ہے، اول فول بک رہا ہے۔ دشمنوں کے جادوگر نے اس کا دماغ خراب کر دیا'' ہے ملک کا پارہ مزید چڑھ جاتا ہے۔

''میں پاگل نہیں ہوں سچ کہتا ہوں۔ پرندہ اب ہمارے پاس ہمارے گھر میں ہے۔ چلیں میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ اگر میری بات جھوٹ نکلی تو پھر جو جی چاہے مجھے وہی سزا دیں۔''

اس سے پہلے کہ لڑکے کا باپ اس کی پٹائی کرے سیانا شخص اسے سمجھاتا ہے۔

''کیا حرج ہے اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے بچے کی بات درست مانیں۔ ہوسکتا ہے یہ سچ بول رہا ہو۔''

جونہی وہ لوگ ملک کی حویلی پہنچتے ہیں لڑکے کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کی ماں بہنیں اور دوسرے تمام لوگ خوش ہو جاتے ہیں اور سب اسے پیار کرتے ہیں۔'' خوشیاں منانے کے بجائے ماتم کرو کیونکہ یہ پاگل ہو چکا ہے'' ملک غصے اور افسوس سے کہتا ہے۔

"نہ جانے کیوں بابا یقین نہیں کرتے میں پرندے کو دیکھ آیا ہوں" لڑکا وہاں موجود لوگوں کو خوش خبری سناتا ہے۔

"کہاں ہے؟" سب پوچھتے ہیں۔

"ہماری حویلی کے پرلے حصے میں۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ لوگ آئیے گا سب اسے دیکھ لیں گے۔"

لڑکا بھاگ کر پچھے گھر کے دوسرے حصے میں آتا ہے اور تھوڑی دیر بعد ان سب لوگوں کو جنہیں اب لڑکے کے پاگل پن کا یقین ہو چکا ہے بلاتا ہے۔

"آ جائیں اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں اس خوبصورت پرندے کو۔"

جونہی وہ لوگ وہاں پہنچتے ہیں تو وہاں موجود تندور سے تیز شعلے نکل رہے ہیں اور پرندے کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔

"کہاں ہے پرندہ؟" لڑکے کا باپ پوچھتا ہے۔

"وہ اس آگ کے اندر بیٹھا آرام کر رہا ہے۔" لڑکا جلتی آگ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "اگر آپ لوگ واقعی اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک شرط ہے!"

"کیسی شرط؟" سب یک آواز پوچھتے ہیں۔

اس آگ میں اپنے ہتھیار پھینکیں۔ پرندہ فوراً ناچنا شروع کر دے گا اور ان شعلوں کے بیچ سے باہر آ جائے گا۔

"پاگل ہے یہ" ملک چیختا ہے۔ "یہ دشمن کی سازش کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ اب ہم سے ہمارے ہتھیار چھیننا چاہتا ہے۔ کوئی پرندہ نہیں نکلے گا اس آگ سے۔"

ملک کی بات دل کو لگتی ہے۔ تمام لوگ اس کی تائید میں چیختے ہیں۔

لیکن سیانا شخص آگے بڑھ کر ان سب کو چپ کراتا ہے۔

"کیوں چیخ رہے ہو، لڑکا پاگل نہیں ہے اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اس کی بات مانیں تو کیا حرج ہے؟"

اس کے ساتھ ہی وہ شخص آگے بڑھتا ہے اور اپنی کلاشنکوف آگ میں پھینکتا ہے۔

جیسے ہی کلاشنکوف آگ میں گرتی ہے وہاں کا سماں بدل جاتا ہے اور ایک میٹھی آواز تندور کے اندر سے نکلتی ہے اور پھر اس وقت تو لوگ زیادہ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں جب آگ کے شعلوں میں سے ایک خوبصورت پرندہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک ایسا پرندہ جس کے پر سونے کے ہیں اور جس کی جاندار آنکھوں اور چونچ پر خوبصورت موتیوں کا گمان ہوتا ہے۔

پرندے کی آمد پر لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ لڑائی پھر رک جاتی ہے۔ اب ایک ایک شخص آگے بڑھ رہا ہے اور اپنا اپنا ہتھیار تندور کی آگ میں پھینک رہا ہے۔ پرندہ مسلسل بول رہا ہے۔ آگ کی سطح پر اڑتا ہوا اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہا ہے اور لوگ اس کی آواز پر رقص کر رہے ہیں۔

اچانک لڑکا باہر کی طرف بھاگتا ہے۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' سب اس سے پوچھتے ہیں

''شمالی بستی کو پرندہ دینے'' لڑکا جواب دیتا ہے۔

براہوی افسانے

ڈاکٹر تاج رئیسانی

انجیر کا پھول

بہت دیر پہلے بڑھاپے کے ڈھلتے حسن کی طرح کمزور سی روشنی جسے وہ اپنے سرخ سے دہانے میں نگل چکا تھا اور جاتے جاتے روشنی کا لذیذ ذائقہ ہونٹوں پر سے چاٹنے کے لیے سورج نے اپنی لال زبان پھیری تھی۔ اس وقت روشنی کے جو چند قطرے ٹپکے تھے وہی شاید اب آسمان پر ستاروں کی صورت میں یوں لرز رہے تھے جیسے روٹی کی خوشبو سے کسی فاقہ زدہ کی رال ٹپک رہی ہو۔ سو پھیلی گہری تاریکی کا احساس ان دیوں کی کمزور روشنی سے کچھ زیادہ ہی گمبھیر سا ہو رہا تھا جو سامنے پڑاؤ کے ایک آدھ گدان میں ٹمٹما رہے تھے یا پھر چکی کے گندم چباتے ہوئے پاٹوں کی اپنی اپنی سی آواز تھی جس پر کبھی کبھی کسی مجبور انسان کی کمزور سے آرزومند لہجے کی سرگوشی کا گمان ہوتا تھا۔ سامنے دور تک ابھری ہوئی چٹانیں تھیں یا اونچے پہاڑ جن کے دامن میں انجیر کے ایک درخت تلے بیٹھی وہ گیت، سوز کی دھن زیر لب گنگناتے ہوئے وہ کبھی آٹے کے چھلنے سے ذخیرہ کو دیکھتی اور کبھی اس کی حسرت بھری سی نگاہیں سامنے قافلے والوں کی جھونپڑیوں کی بے ترتیبی میں الجھنے لگتی تھیں جہاں تھکے ہارے نوجوان محو خواب تھے یا پھر اس کی ہم عمر لڑکیاں ندی کی ریت کی طرح پاؤں کو گدگداتے ہوئے بکھر جانے کی سی خواہش

لیے اپنے شوہروں کے بازوؤں کو مضبوط ترین گردان کر مستقبل کو اپنی آنکھوں میں محسوس کر رہی ہوں گی۔

ایک ہفتہ قبل ان کا خانہ بدوش قبیلہ سندھ کے میدانوں سے دشت کی جانب روانہ ہوا تھا۔ راستے بھر وہ زمین کے مویشیوں سے زیادہ بھوکی نظروں سے چارہ تلاش کرتے ہوئے آئے تھے اور جب کہیں وہ کسی برساتی گڑھے میں گدلا پانی دیکھ لیتے تو ان کے دل کسی بے آواز سی محسوس تال پر رقص کرنے لگتے تھے۔ اس سال طویل انتظار کے بعد ان کے علاقے میں بارش بروقت ہوئی تھی اور قافلہ خشک ہونٹوں کی زرخیزی کے صدیوں پرانے گیت یوں عاجزی سے گاتا ہوا آیا تھا جیسے کوئی بوڑھا اپنی نوبیاہتا بہو سے آنے والی نسلوں کی کسی نشانی کے ارمان کا اظہار کر رہا ہو۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنی زمین پر چراگاہوں میں گواڑخ اور نیلی کے پھولوں کا قالین سا بچھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ خود اس کا تعلق اسی قبیلے کی نچلی ذات کے ایک خاندان سے تھا جو نسل در نسل صرف خدمت ہی کرتا آیا تھا۔ اس کا باپ قبیلے کا لوہار تھا جو قبیلے کے مردوں کے لیے کلہاڑیاں اور خنجر اتنی ہی محنت اور لگن سے بناتا تھا جس لگن سے وہ گھوڑوں کے لیے نعل، عورتوں کے لیے چاندی کے زیورات بناتا یا کسی کی شادی پر ڈھول بجایا کرتا۔ اس کا بھائی شہنائی بجاتا تھا۔ وہی پڑاؤ پڑنے پر دور دور سے خشک لکڑیاں اور جھاڑیاں جمع کر کے اسے لا دیتا جس سے بڑا سا الاؤ جلا کر وہ رات بھر آٹا پیستی اور پورے قافلے کے لیے روٹیاں پکاتی۔ یوں شاید اس کا زمین سے بہت قریبی سا رشتہ بنتا تھا۔ تبھی سیلاب کے بعد زمین کی اوپری سطح کی درازوں کو دیکھ کر اس کی نظروں میں ایسی کشش سی ابھر جاتی تھی جیسے اپنے سسر کو آئندہ نسل کی کوئی نشانی دیے بغیر اس کے چہرے پر امر بیل اُگ آیا ہو۔

بروقت بارشوں کا سن کر وہ بہت زیادہ خوش تھی کہ اب زمین سنہری خزانہ اُگل دینے پر رضامند سی لگتی تھی۔ وہ سوچتی اب ان کی خالی بوریاں گندم سے بھر جائیں گی اور وہ رات رات بھر چکی پیستی رہے گی۔ خوشی کا یہ خیال کہ جتنی زیادہ گندم ہوگی اتنی ہی زیادہ قافلے کے ہر فرد کا حصہ ہوگا، اسے کچھ پریشان سا بھی کرنے لگتا تھا کہ جتنی زیادہ قافلے والوں کے پاس گندم ہوگی

اس قدر چکّی پیسنے سے اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑیں گے اور درد کی شدت میں پھر اسے سوز و کے وہ بول یاد آجاتے تھے جو قافلے کے نوجوان اپنی بھری بھری سی آوازوں سے بیابانوں میں پھیلاتے تھے جن میں سوز و کے سانولے ہاتھوں کی مہندی کے لیے وہ اپنا لہو دینے کے آرزو مند لگتے تھے اور اس کے دل میں یہ بول زمین پر تپتے سنگریزوں کی طرح گونجنے لگتے تھے۔ جب وہ سوچتی کہ اپنے خالی ہاتھوں کے چھالوں کے لیے وہ کسی نوجوان سے آتش دان کی راکھ مانگنے کے حق سے بھی محروم ہے کیونکہ ان کے قبیلے میں بڑیوں کو رسومات کی لاٹھی سے ریوڑ کی طرح مخصوص پگڈنڈیوں پر ہی ہانکا جاتا تھا۔ قافلے کے بنجر راستوں اور سلگتے ہوئے صحراؤں میں اگرچہ وہ کسی اونٹنی کی مہار تھامے رہتی تھی لیکن جب اونٹنیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے سروں پر قافلہ سفر کے روایتی لوک گیت گاتا تو وہ بھی اسی خلوص اور چاہت سے اپنی آواز ہوا کی ان لہروں میں سمو دیتی تھی جن پر بہت سی آوازیں کسی رنگ کی مانند جیسے دوڑتی رہتی تھیں۔

اس وقت بھی جب وہ گنگنا رہی تھی تو رات کی سسکتی ہوئی سائیں سائیں جیسے خود کو اس کی آواز کے سپرد کرنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ پاس ہی کہیں چکّی کی گڑگڑ کرتی آواز بھی محافظ دستے کی طرح ٹہل رہی تھی۔ کچھ ہوا سے ٹکرانے والے انجیر کے کچھ چوڑے پتے جیسے اس سارے سرگم کو تال دے رہے تھے۔ رات پچھلے پہر کے اوس میں بھیگ رہی تھی۔ وہ بہت سا آٹا پیس چکی تو اس نے سوچا کہ اسے روٹیاں پکانی شروع کر دینی چاہئیں ورنہ صبح تک تمام لوگوں کے لیے اگر وہ پوری روٹیاں نہ پکا سکی تو لوگ شاید اس کی بوٹیاں چبانے سے بھی دریغ نہ کریں۔ چکّی نے چلتے پاٹ کو روکنے کے لیے جونہی اس نے ہاتھ بڑھایا، اسے اپنے گرد چاند کے ہالے کی سی روشنی کا احساس ہوا جس میں اس کے ساتھ ساتھ انجیر کا پورا درخت بھی محصور تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ گونج کی ایک لہر سی جیسے اس کی رگوں میں دوڑ گئی۔ اس نے دیکھا وہ روشنی انجیر کی ایک باریک سی شاخ پر کھلے پھول سے چھوٹ رہی تھی۔ اسے ایک دم اپنی دھڑکنیں اتنی تیز لگیں کہ لرزتے پاؤں میں پازیب کی آواز بھی جیسے دبنے لگی۔ انجیر کے پھول سے متعلق تمام روایات برسات کے طوفانی چھینٹوں کی طرح اس کے ذہن پر برسنے لگیں۔ قبیلوں کا عقیدہ ہے کہ انجیر کا

پھوں صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کی تقدیر خدا جلد ہی بدلنے والا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ انجیر کا پھول ایک بار جس چیز میں رکھ دیا جائے اس کی مقدار مسلسل استعمال کرنے کے باوجود ابد تک کم نہیں ہوتی۔ اس نے جھپٹ کر نرم شاخ کو پکڑا تو شاخ میں اس کی کمر کی طرح کا خم سا پیدا ہوا۔ ننگے بازو سے مس ہونے والے انجیر کے کھردرے پتوں کی خراش سے اسے یک بے نام سے خوف کا احساس بھی ہونے لگا کہ ایسا نہ ہو پھول کے سحر سے پتوں کے نوکیں سنگین بن جائیں۔ لیکن اتنی دیر میں آس کی انگلیاں بھیگی روئی کی طرح نرم پھول کو چھونے لگی تھیں۔ جسم کی تمام تر نزاکت اس کی انگلیوں میں جیسے بھر آئی اور اس نے انجیر کا پھول شاخ سے توڑ لیا۔

نہ جانے وہ چمکتا پھول اُس کی کھردری ہتھیلی پر کیسا تاثر پیدا کر رہا تھا کہ اس کی تمام خواہشیں جاگنے لگیں۔ وہ سوچنے لگی کہ پھول اپنے چاندی کے زیورات میں رکھ دے۔ پھر ایک ایک کر کے سارے زیورات قافلے کی لڑکیوں میں بانٹ دے اور ان کی جگہ کوئی فرشتہ بالکل ویسے ہی زیورات پھر وہیں لا کر رکھ دے گا، مگر پھر فوراً ہی اسے یاد آیا کہ قبیلے کی ہر لڑکی کے پاس اس سے کہیں زیادہ چاندی کے زیور ہیں۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ مرغ پہلی بانگ دینے لگے۔ اسے فوراً روٹیاں پکانے کا خیال آیا۔ اس نے پھول اپنے کُرتے کی لمبی سی جیب میں رکھ لیا اور جلدی جلدی الاؤ سلگانے لگی۔ اس نے جونہی آگ جلانے کے لیے سلگتی جھاڑیوں میں پھونک ماری ہوا کی شہ پر کچھ چھوٹے چھوٹے شعلے اور چنگاریاں اس کی جانب لپکے۔ اسے خدشہ سا محسوس ہوا کہ اگر اس نے پھول کو کسی محفوظ جگہ پر نہ رکھا تو شعلے پھول کے ساتھ اسے بھی جلا دیں گے۔ الاؤ سے کچھ دور لیٹ کر وہ پھر ہر چیز اور اس کی اہمیت کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ اس کے پاس چاندی کے جو چند سکے ہیں وہ پھول انہیں کے ساتھ رکھ دے اور روز وہاں سے سکے اٹھا کر تھیلوں میں جمع کرتی رہے۔ اس طرح جلد ہی اس کے پاس ڈھیروں پیسے جمع ہو جائیں گے لیکن اسی لمحے قافلے کا ایک گدھا یوں شور مچانے لگا کہ جیسے اسے یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہو کہ سکوں سے بھری ہوئی بوریاں بہت بھاری ہوتی ہیں اس

کے پاس اتنے تو اونٹ یا گدھے بھی نہیں ہیں جن پر وہ بوریاں لاد کے قافلے کے ساتھ ساتھ پھرتی رہے۔ گدھ خاموش ہوا ہی تھا کہ ہوا میں جھکتی ہوئی خشک ٹہنیوں کے چٹخنے کی آواز اسے وقت گزرنے کا احساس دلانے لگی۔ اس نے پھر سوچا اسے روٹیاں پکانی چاہئیں ورنہ صبح سردار کو کیا جواب دے گی کہ رات بھر کیا کرتی رہی ہے۔ پھول پھر اپنی جیب میں چھپا کر اچانک اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ آٹے کو چھوڑ کر ایک دم اس جھونپڑی کی طرف دوڑی جہاں ان کا سامان پڑا تھا۔ سامان کے قریب اونگھتے تھے کچھ دیر تک وہ جلدی جلدی چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی اور پھر ایک بوری کا منہ کھول دیا جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ پھول کو اس بوری کی قید میں چھپا کر وہ لوٹی۔ وہ بالکل مطمئن تھی۔ پھر یہ سوچ کر وہ خود ہی مسکرانے لگی کہ گندم کی وہ نصف بوری اب کبھی خالی نہ ہوگی اور نہ کبھی قحط سالی میں قافلے کے لوگ بھوکے بکریوں کو ذبح کریں گے۔ گرچہ اس طرح اس کے ہاتھوں میں ہمیشہ چھالے رہیں گے مگر کسی کا خون نہیں بہے گا۔

ظفر مرزا

چیخ

رات کے اندھیرے میں ابھرنے والی اس معدوم چیخ کی آواز سن کر لوگ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ایک عجیب سی چیخ تھی جس کی گونج سے درختوں پر سوئے ہوئے پرندے تک تاریکی میں اڑنے لگے۔ لوگ گھروں سے باہر نکلے۔ حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے سے چیخ کی آواز کی سمت دریافت کرنے لگے۔ مگر کوئی نہ بتا سکا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ خوفزدہ لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آواز چاروں سمتوں سے سنائی دی تھی۔ چند روز قبل کے طوفان نے پہلے ہی ایک بڑی تباہی سے دو چار کیا تھا۔ ہنستے بستے اور خوشیوں سے آباد کچے گھروں کے مکین بے گھر ہوگئے تھے، بہت سارے مکان پہاڑوں کی طرف سے آنے والے پانی کے ریلے میں بہہ گئے تھے۔ جو کسی صورت میں بچ گئے تھے وہ مسلسل بارش اور چھتوں کے ٹپکنے کی وجہ سے منہدم ہوگئے تھے۔ چند بڑی اور پختہ عمارتیں بھی طوفان کی زد میں آ کر ردگرد بکھیل گئی تھیں۔ دو درخت جڑ سے اکھڑ کر دھڑام سے نیچے آ گرے تھے۔ کون جانتا تھا کہ بستی اتنے بڑے طوفان کا سامنا کرے گی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ دوپہر کے

وقت جیسے گرمی کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔مغرب کی جانب سے تیز ہوائیں چلنی شروع ہوگئیں۔مئی کا ایک طوفان سا اٹھا تھا۔تیز ہوائیں اپنے ساتھ چلتن کے پہاڑوں سے کالے بادل لے کر آئیں۔ذراسی دیر میں آسمان کھل کر برسنے لگا۔لوگ دل میں خوش ہوئے کہ اسی بہانے گرمی کی شدت میں کچھ کمی ہو جائے گی لیکن بارش کی شدت میں ناگواری کی حد تک اضافہ ہونے لگا۔وقفے وقفے سے ژالہ باری بھی ہونے لگی۔باغوں کے رکھوالے اور مالک دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ژالہ باری تیز تر ہونے لگی۔ہواؤں کے تھپیڑے اپنا زور دکھانے لگے۔لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔انجانے واہموں اور خوف کی وجہ سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔طوفانی ہوائیں اور بادو باراں اپنا کام دکھانے میں مصروف تھے۔وہ اس کو روکنے یا اس کا مقابلہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ماسوائے تماشا دیکھنے کے۔اس تماشے میں جو کچھ ہوا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے دل بیٹھنے لگتا ہے۔کوہ مردار سے آنے والے بارش کا پانی سب کچھ سمیٹ کر اپنے راستے میں آنے والی ہر ایک چیز کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔گھر کے گھر اجڑ گئے۔آہ و بکا اور چیخوں کی آوازیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔بچھڑے ہوئے لوگ اپنے عزیز واقارب کی تلاش میں سرگرداں تھے۔گویا ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔خاندان کے خاندان طوفان کی زد میں آکر تباہ ہوگئے تھے۔بستی کے قریب کاریز زمین بوس ہونے سے ان کے اوپر بنائے گئے گھر دھنس کر بے نام ونشان ہوگئے تھے۔ایک بڑی قیامت خیز تباہی کے بعد طوفان تھم گیا۔بربادی کے اس خوفناک منظر کو دیکھتے ہوئے دل کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔

لوگوں کے دلوں پر اب تک اس تباہی کا خوف طاری تھا کہ رات کے اندھیرے میں اٹھنے والی اس چیخ نے ان پر دوبارہ لرزہ طاری کر دیا تھا۔دور سے آتے ہوئے ایک شخص نے بتایا کہ یہ چیخ کوہ مردار کے دامن میں بھی سنائی دی تھی۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی تڑپتی ہوئی روح چیخ رہی ہے۔لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چیخ کسی عورت کی تھی لیکن بعض لوگ اس وہم میں تھے کہ یہ کسی خوفناک بلا یا درندے کی چیخ تھی۔

اگلی رات پھر یہ چیخ سنائی دی۔ بستی کے چند نوجوان بندوقیں اور لاٹھیاں لے کر آواز کی سمت روانہ ہوئے لیکن مایوس ہو کر پلٹ آئے۔ اگلے دن پو پھٹتے ہی لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف نکل پڑے۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ رات کے جاگے ہوئے ہیں۔ بچے لاپروائی سے بارش کے پانی کے ساتھ آنے والی ریت پر کھیل رہے تھے۔ ایک بچے کو ریت کے ڈھیر میں سے کسی بچے کا پیر نظر آیا۔ سارے بچے جمع ہو گئے اور اردگرد سے ریت ہٹانے لگے۔ ریت کے تہہ در تہہ ڈھیر سے ایک معصوم اور نوزائیدہ بچے کی لاش برآمد ہوئی۔ بچے گھبرا کر اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑے۔ یہ خبر سن کر کچھ لوگ وہاں آ گئے جیسے بچہ میٹھی نیند سو رہا ہو۔ اس کے منھ میں چوشک (چوسنی) اب بھی موجود تھی۔ اس لمحے وہ چیخ دوبارہ ابھری۔ اب آواز قریب تھی جس سے واضح ہو گیا کہ وہ چیخ کسی عورت کی ہے۔ لوگوں نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی مگر دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ بچے کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کے بقول اس عورت کی چیخ کے ساتھ ہی بچے کی آنکھ ایک لمحے کے لیے کھل گئی۔ اس کے منھ سے چوسنی گر گئی۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں نے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک شخص نے بچے کو پہچانتے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا، ''ارے یہ تو شکر خان کا بیٹا ہے۔ بے چارے ماں باپ اپنی پہلی اولاد کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔'' قریب کھڑے ایک شخص نے اپنی حیرت سمیٹتے ہوئے اس شخص سے پوچھا، کہاں رہتے تھے یہ لوگ؟ اس نے بتایا کہ ان کا گھر کوہ مردار کے دامن میں تھا گزشتہ دنوں طوفان میں ان کا گھر تباہ ہو گیا۔ شکر خان کی بیوی زیب النساء جھونپڑے سمیت تیز رو پانی میں بہہ کر جانے والے بچے کو بچانے کے لیے پانی کے ریلے میں کود گئی تھی بے چاری زیب النساء کی لاش اگلے روز کافی فاصلے پر دشت میں پڑی پائی گئی تھی لیکن اس بچے کی لاش غائب تھی کہتے ہیں بچے کی لاش دفنانے کے بعد اس عورت کی چیخ دوبارہ نہیں سنی گئی۔

وحید زہیر

ادھورے خواب

جس طرح آسمان سے ٹوٹتے ہوئے ستاروں کے متعلق کبھی بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں گریں گے، اسی طرح قسمت کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ آدمی کو بے لگام گھوڑے کی طرح نہ جانے کہاں پھینک دے۔ یہی کچھ موت کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نہ جانے کس خاک میں دفن ہو جائیں، پھر اس خاک کی مرضی کہ وہ ہمیں اپنے سینے پر جگہ دے یا نہیں۔ ہم اور طوفان تو مدت سے آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف ہیں۔ ہم تو جیسے ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ زندگی ...... ہاں یہ زندگی بھی تو وقت گزاری کا دوسرا نام ہے۔ صد حیف ہے کہ وہ طوفان، آگ، قحط، افلاس میں بھی ہماری وقت گزاری کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ ویسے تو بے در و دیوار گدان سے ہمارا اپنا سایہ بھی بہت دور بھاگ جاتا ہے مجھے تو اپنے مضبوط حوصلے پر اتنا بھروسہ ہے کہ کہیں میرے حوصلے کی گرمی و تپش سے پہاڑ نہ پگھل جائیں۔ آج کی یہ رات کافی بھیانک ہے ہوا بھی گدان سے شوخیاں کر رہی ہے۔ تیز و تند یخ بستہ جسم کو چیرتی ہوئی ہوا۔ گھپ اندھیرا اور یہ تنہائی کا عالم میرے دل کی عجیب کیفیت ہے۔ سب اپنے اپنے گدانوں میں نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ سارے ماحول سے بے خبر نیند کی آغوش میں چھپ گئے ہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ

طوفان ... یہ طوفان مجھ سے اپنی پرانی رسم دوستی نبھا رہا ہے۔ مجھے تو آج طوفان کی شدت کا بخوبی اندازہ ہوا ہے جس میں شدت کی کپکپی سی ہے۔ آگ کے قریب جاتا ہوں تو تپش سے بدن جھلسنے لگتا ہے اور جب آگ سے دور ہوتا ہوں تو سردی کی شدت ... آخر کیوں میرا پورا وجود بے حس ہو رہا ہے۔ آسمان کی پیشانی پر پھیلے ہوئے بادل انسان کی پیشانی کی سلوٹوں کی مانند گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ بجلی کی چمک سے بادل کچھ اور نمایاں ہو گئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے کمزور سے بے در و دیوار مکان ہوا کی شدت اور موسم کے غصے کی نذر ہو کر ڈھ جائیں۔ یہ میرے منہ زور کتے کو بھلا کیا ہوا جو ہر وقت تو ہلکی سی آہٹ پر بھی گھنٹوں بھونکتا رہتا۔ شاید اسے بھی طوفان کی اصل حقیقت کا آج ہی پتہ چلا ہے۔ ایک تو شرابی پر بھی شراب کا نشہ اتنا شدید اثر نہیں کرتا کہ جتنا اثر کسی سے پینے کا ہوتا ہے۔ پورا بدن نشے سے چور، پور پور کچھ ہوش ہی نہیں۔ آنکھوں میں ایک محبت جیسا خمار سوزو کی ساغر جیسی آنکھوں کا خمار بھی تو کچھ کم نہیں، جو اندھیری راتوں میں بھی سرور پیدا کرتی ہیں۔ مجھے امید ہے۔ ہاں امید ہے کہ اس اندھیری اور تنہائی کی رات کو صبح کی روشنی اجالوں کا پیغام دے گی۔ یقیناً یہ رات ایک یادگار رات ہے۔ طوفان کی بے قراری و شدت دل کی دھڑکنوں کا شور ہاں یہ رات واقعی یادگار ہے۔ میں صبح کا منتظر ہوں اور وہ آنے والی صبح میری زندگی کی نئی صبح ہوگی۔ سوزو کی سانولی صورت ہر طرف ہر سمت دکھائی دے رہی ہے۔ آج کی ملاقات ابھی آج میں اپنے بدمست گھوڑے پر سوار خیالات کی دنیا میں گم رواں دواں تھا کہ یکا یک سنبل مستی میں آ کر بھاگنے لگا اور میں اس کی اس تیز رفتاری کے باعث اپنے آپ پر قابو نہ رکھنے کی وجہ سے گیند کی مانند دور جا گرا۔ اچانک کسی نے مجھے سہارا دیا اور مجھے سنبھلنے کی ہمت دی۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میری سوچ کا مرکز اندھیری راتوں میں روشنی، ایک پیغام پیامبر اور میری تنہائی بانٹنے والی سوزو میرے سامنے تھی۔ ہاں سوزو، ایک عجیب ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے لگی ''تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔'' ''نہیں،'' میں نے قدرے اعتماد سے جواب دیا۔ ''مگر سنبل کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا تو وہ حیرت سے کہنے لگی، ''کون سنبل؟'' ''سنبل ... سنبل میرے گھوڑے کا نام

ہے۔'' سوزو کہنے لگی ،اچھا وہ تو ٹیلے کے اس پار ہے۔ ہم دونوں سنبل کے پاس پہنچے تو دیکھ کر اس کی ایڑیاں زخمی ہیں۔ سوزو اپنا آنچل دے کر کہنے لگی لو اس سے اس کے زخموں پر پٹی باندھ دو۔ میں نے آنچل اس کے ہاتھ سے لے کر اس کے سر پر ڈال دیا۔ سراپا شرم و حیا کی صورت مسکرانے لگی جیسے کلی کھل کر مسکراتی ہے بالکل چھوئی موئی کی طرح۔ جی چاہا کہ اسے دل سے لگا دوں مگر جوں ہی میں فرط جذبات سے آگے بڑھا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے روکا۔ میری نظر اس کے زخمی ہاتھ پر پڑی تو میں نے پریشان ہو کر پوچھا ،سوزو کیا بات ہے؟ یہ تیرے ہاتھ کیوں زخمی ہیں؟ بولی یہ تمہاری نشانی ہے۔ اس کی خوب صورت اور جھیل سی شرماتی آنکھوں میں شکایت کا تاثر تھا۔ ''میری نشانی،'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہاں تمہاری نشانی۔'' اس نے پھر کہا۔ ''کل جب تم یہاں سے گزر رہے تھے تو میں ندی سے پانی بھر رہی تھی۔ میری نظر تم پر پڑی میں تمہارے خیالوں میں گم تھی کہ میرے پاؤں پھسل گئے۔ گرنے سے مجھے یہ چوٹ لگی۔''

میں نے از راہ تمسخر کہا، ''تو پھر سنبل کا گرنا بھی مصلحت کے تحت تھا یعنی تم نے اپنا بدلہ میرے گھوڑے سے لیا۔ اسے گرا کر زخمی کر دیا لیکن لیکن سوزو، اب میں بھی تم سے اپنا بدلہ لے ہی لوں گا۔'' میری یہ بات سن کر سوزو کہنے لگی، ''وہ کیسے ''میں نے کہا کہ ''کل صبح تمہیں اس وقت پتہ چل جائے گا جب میں اپنے سردار کے ساتھ آ کر تمہیں محبت اور وفا کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ لوں گا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد دشت کی یہ گوارخ (گل لالہ) میرے گدان کی زینت بنے گی اور میں سنبل پر بیٹھ کر ہوا میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

پھر یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی مجھے ہوش میں لانے اور خواب سے جگانے کے لیے مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈال رہا ہو۔ اوہ یہ تو بارش کے تیز قطرے میرے اوپر پڑ رہے ہیں۔ یا خدایا میری زندگی کی نئی صبح کب ہو گی؟

اس کے ساتھ ہی اچانک گولی چلنے کی آواز آئی پھر اندھا دھند آوازیں آنے لگیں۔ گیدڑوں کی آوازیں بھی نیند کوسوں دور لے جاتی ہیں جیسے بہتے ہوئے منہ زور پانی کا اگر راستہ روک دیا جائے تو وہ طوفان کی بد دعا دیتی ہے۔

اچھا ہوا.... اچھا ہوا.... یہ کیسی آوازیں ہیں، اتنی دور آنے والی آوازیں جیسے میرے گدان کے ہی قریب ہی ہوں۔ میں گدان سے نکلا دیکھا کہ سردار اور کچھ لوگ کچھ دور کھڑے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ سردار صاحب سردار صاحب سوزو اور شامو کو اس کے بھائی نے سیاہ کاری پر مار دیا۔ وہ قتل ہوئے۔ سردار ہنس کر کہنے لگا اچھا ہوا اچھا ہوا، جب تک ہمارے نوجوان زندہ ہیں نامردوں کی موت اسی طرح ہوتی رہے گی۔ یہ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا اور میرا پورا وجود جلنے لگا۔ میں جلدی جلدی گدان کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ ہر طرف تاریکی کا سماں تھا۔ کچھ ہی لمحہ پہلے گدان میں ہر طرف قوس وقزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اب پورا گدان سیاہ نظر آرہا تھا۔ مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں آخر کس سے اپنا بدلہ لوں میں تو اپنے آپ کو ایک گلی سڑی لاش کی مانند سمجھ رہا تھا۔ اب تو غموں کے کوے مجھے نوچنے میں مصروف تھے۔ زمین اور ماں کا سینے تو پاکیزگی کی علامتیں ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہی ماں ان عاصیوں کو کیوں اپنے سینے سے نہیں لگاتی یا اسے بھی ہر ماں کی طرح مجبوریاں آگھیرتی ہیں۔ پھر اس کے بعد ایک دن میں بے خودی میں ان کی قبروں پر سے گزر رہا تھا کہ مجھے ایک آواز نے چونکا دیا۔ تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو، میں نے ادھر ادھر دیکھا تو شاتل کھڑی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے پتہ تھا کہ تم ضرور ادھر آؤ گے اور تم بھی سوزو بہن کی طرح لمبی راتوں کو جاگنے میں گزار رو گے مگر نہ جانے یہ کیسی رات تھی اس رات دیگدان کے پاس کسی چیز کی آواز آرہی تھی۔ بہن سوزو یہ آواز سن کر دیکھنے کے لیے باہر گئی تو وہاں وہ شامو کو کچھ چوری کرتے ہوئے دیکھ کر ڈر کے مارے واپس پلٹ گئی اور لالا کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کے لیے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شامو چور نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اتنے میں لالا بھی آپہنچا شامو نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لالا نے اسے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ پھر لالا نے کچھ دیر سوچ کر دوسری گولیاں معصوم سوزو کے سینے میں پیوست کردیں اور بے گناہ معصوم سوزو نے دم توڑ دیا۔ میں نے لالا کو غصے سے جھنجھوڑ کر پوچھا کہ "یہ یہ تم نے کیا کر دیا۔ لالا سوزو کی کیا خطا تھی؟" لالا نے اس وقت تو کچھ نہ کہا مگر پھر لوگوں سے یہ کہا کہ جیسے سیاہ کاروں کے ساتھ ہوتا ہے، میں نے بھی وہی

کچھ کیا۔ یقیناً میں نے اپنی غیرت کا پاس رکھا۔ شائستل پھر آو بھر کر کہنے لگی کہ میں نے لالا سے بار بار کہا کہ سوزو بے قصور تھی۔ اسے تم نے کیوں مار دیا؟ کیا بہن کا بوجھ اتنا ہی بھاری تھا۔ آخر ایک دن میرے بار بار کے اصرار پر لالا نے سب کچھ کہہ ہی دیا۔ سارا راز فاش کر دیا۔ اس نے مغموم ہو کر جواب دیا۔ شائستل سوزو بہن واقعی بے قصور اور معصوم تھی مگر جب میں نے شامو کو قتل کر دیا تو میرے اوپر اس کے قتل کا الزام ٹھہرتا تھا کہ اس قوم کے لوگ بھلا مجھے کب زندہ چھوڑتے۔ اسی لیے میں نے اپنی جان بچانے کے لیے سوزو کو بھی مار دیا تھا کہ سیاہ کاری کی آڑ میں اپنے گناہ پر پردہ ڈال سکوں۔ لیکن اب مجھے یقین ہے کہ میں نے مردانگی نہیں کی اور محض غلط رسموں کی تقلید کی۔ شائستل کہنے لگی، "کاش میں ہی سوزو کی جگہ ہوتی۔ اب اس میں قصور کس کا ہے؟ ایسے سماج میں بھلا کون ارمانوں کی دنیا دل میں آباد کر سکتا ہے؟ اور ایسے ماحول میں بھلا کون رہ سکتا ہے کون؟ بولو، جواب دو۔ تم بھی تو مرد ہو۔ بھلا یہ کیسی مردانگی ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بس بے خودی میں سوزو کی قبر کو تکتا رہا۔ میرے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اور مجھ پر بے حسی کی کیفیت طاری تھی جیسے کسی سانپ نے مجھے ڈس لیا ہو۔ میرے سارے خواب ادھورے رہ گئے۔

وحید زہیر

آخری نظر

.. گلو ایک عرصے سے نیند کو ترس رہا تھا۔ واقعی چوکیداری نیند کی دشمن ہوتی ہے۔ نشیب کی جانب لڑھکنے والا پتھر بالآخر ایک جگہ پر آ کر رکتا ہے، بالکل اسی طرح سوچ بھی لڑھکنے والے پتھر کی طرح کہیں جا کر رک جاتی ہے۔ کتے کی چوکیداری اس کی فطرت کا تقاضہ ہے اور اس کی وفاداری کی علامت بھی۔ لیکن آدمی کے لیے آدمی کی چوکیداری اس کی مجبوری ہے۔ وقت کائنات کا سب سے بڑا چوکیدار ہے۔ آج یوں محسوس ہو رہا ہے کہ وقت بھی بوڑھا ہو چکا ہے کیونکہ اس کی رفتار بہت تیز ہو چکی ہے۔ اس بوڑھے کی طرح جو عمر کے آخری مراحل بہت تیزی سے طے کرتا ہے گویا اس کے بڑھاپے نے وقت کے چہرے پر بھی جھریاں ڈال دی ہیں، ماما گلو نے سوچا۔

ماما گلو اپنی اندھی بیوی راجی اور نوجوان بیٹی لالی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے چوکیداری کرتا تھا۔ دن بھر وہ چلم کے کش لگاتا رہتا۔ یا پھر سویا رہتا۔ لالی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی اور اڑتی ہوئی تتلیوں کے واسطے سے شناسا ہو چکی تھی۔ اس کے لیے ایک دو رشتے آئے مگر ماما گلو نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بچی ابھی کم عمر ہے۔ ویسے بھی اسے اپنے اور اپنی اندھی

بیوی کے بیے سہارے کی ضرورت تھی۔ رات کی چوکیداری کے بعد جب گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا، اس کا رنگ فق ہو گیا کہ رات میرے گھر میں کوئی مرد آیا ہے۔ صحن میں جوتوں کے نشانات اور عطر کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ عورت ذات پر اس کا شبہ ہمیشہ کی طرح آج بھی قائم تھا، بلکہ آج تو اس نے اپنے شک کو یقین میں بدلتا ہوا محسوس کیا۔ جب کبھی وہ اپنی بیوی سے عورتوں کی مکاری کی بابت اظہار خیال کرتا تو بیوی فوراً بول پڑتی کہ ''شکر ہے کہ میں اندھی ہوں۔''

یقیناً میری بیوی کے اندھے پن نے کسی اجنبی کے لیے میرے گھر کے دروازے کے بند کواڑ کھول دیے ہیں، ماما گلو نے سوچا۔ وہ غصّے کے عالم میں اپنی بیوی کے کمرے میں گیا۔
''رات گھر میں کوئی آیا تھا کیا؟''

''نہیں تو'' بیوی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہاں تم تو اندھی ہو، تمہیں کیا معلوم'' ماما گلو کی یہ بات سن کر راجی کی بے نور آنکھیں تیزی سے اپنے حلقوں میں ادھر ادھر پھیلنے اور سکڑنے لگیں یوں لگ رہا تھا جیسے غصے سے اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں گی۔

''تو پھر آج ایک اندھی سے کیوں پوچھا جا رہا ہے؟'' بیوی کے آخری جملے پر وہ غصے میں کمرے سے باہر نکلا تاکہ لالی سے پوچھ سکے مگر لالی اس وقت سو رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار عورت کو عورت سمجھ کر اس کے ہر فعل کو مکاری سمجھنے لگا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بالکل اس بچے کی سی تھی جو اپنے منہ سے زمین پر گرے ہوئے لالی پاپ کو دیکھتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ اسے صاف کر کے واپس منہ میں رکھ سکتا ہے مگر اسے خیال آتا ہے، کسی نے دیکھ لیا ہوگا اور پھر غصے میں آ کر لالی پاپ کو جوتے تلے روند کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ماما گلو سوچ رہا تھا کیا میں بھی ایسا کر سکوں گا؟ نہیں، نہیں ہرگز نہیں، یہ میری عزت کا سوال ہے۔ دوسرے دن ماما گلو سر شام گھر سے نکلا لیکن وہ اپنی ڈیوٹی پر نہیں گیا بلکہ گھر سے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر اس نے آنکھیں اپنے گھر کے دروازے پر لگا دیں۔ اسے چوکیداری کرتے ہوئے پندرہ سال

ہو گئے تھے مگر آج اس نے صحیح معنوں میں چوکیداری کے بوجھ کو محسوس کیا۔ اس نے مجبوری کی دیوار ڈھا کر اپنی عزت کی دیوار بچانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں سوچوں کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا۔ اگر وہ اجنبی نوجوان آج آیا تو میں اسے قتل کر دوں گا لیکن اس کے بعد لالی کا خون بھی تو کرنا ہوگا، یہی دستور ہے غیرت کا مگر میں اپنی بیٹی کو کیسے قتل کر دوں کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ آج یہ فرض نبھا بھی چکا ہوتا۔ بہن پر بھائی کا فرض اور بیٹی پر باپ کا فرض اس بلی کی طرح ہے جو رات دن چوہوں کی تاک میں رہتی ہے۔ اس وقت اس کا وہم راہ گیر کے ساتھ اس کے دروازے تک سفر کرتا اور جب راہ گیر آگے نکل جاتا تو وہ ایک لمبا سانس لے کر رہ جاتا۔ رات بھر کی بے چینی اور بے خیالی نے اسے سُن کر دیا۔ صبح ہوتے ہی وہ آنکھیں ملتا ہوا گھر میں داخل ہوا ایک لمحے کے لیے اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کل کے نشانات سے مختلف نشانات آج بھی تھے ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا جیسے کوئی دف بجا کر اسے جگا رہا ہو۔ اسے چکر آنے لگے ایک دم سے اس کے ذہن کے پردے پر فلم چلنے لگی، جس میں اسے کئی نوجوانوں کے کردار پر شک گذرا۔ ہو نہ ہو یہاں بالی آتا ہوگا کیونکہ اس کے تعلقات زیادہ ہیں لڑکیوں کے ساتھ۔ کیوں نہ جا کر اسے قتل کر ڈالوں۔۔۔ مگر بغیر کسی ثبوت کے؟ اس وقت کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوا تو بیٹی یوں سوئی ہوئی تھی کہ جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ سنا تھا انسان بڑھاپے میں ذلیل ہوتا ہے میں بھی تو واقعی ذلیل ہو رہا ہوں، مگر کب تک؟ آج وہ دن بھر گھر سے باہر رہا کہ شاید کسی ہوٹل کھوکھے یا کسی فٹ پاتھ پر نوجوان اس کی بیٹی کا ذکر کر رہے ہوں۔ ہر آدمی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ خود بخود نادم سا ہو جاتا۔ آج اس نے اپنی کلہاڑی کی دھار تیز کر والی تھی تاکہ اس کے رعشہ زدہ ہاتھوں کی لرزش اس کی دھار میں چھپ جائے۔ اب وہ گزشتہ رات کی طرح گھر سے نکلا اور اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تاریکی گہری ہوئی وہ آہستہ آہستہ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر پچھلی دیوار چڑھ کر اپنے گھر کی چھت پر آ بیٹھا اور حملہ آور ہونے والی بلی کی طرح فضا کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ لالی اپنی چارپائی سے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد

کمرے میں داخل ہوئی۔ اب تو ماما گلو کا جسم بہت تیزی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ اور ریڈو مستعد ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے کمرے سے نکلتے ہوئے سائے کے ساتھ وہ بھی آہستہ سے چھت پر آگے کھسکنے لگا اور وہاں سے گھٹنوں کے بل گرا، صرف اتنا دیکھ سکا کہ لالی نے مردانہ جوتے پہن رکھے تھے!

وحید زبیر

گرو

جواب طلبی بے کار آدمی کی نہیں ہوتی ہمیشہ زیادہ کام کرنے والے کی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کام میں جنون کی حد تک محو رہنا انسان کو بے خود کر دیتا ہے۔ اگر ریس کا گھوڑا جیت جائے تو گھوڑے کی تعریف میں مکان زمین آسمان کی قلابیں ملانے لگتے ہیں مگر ہارنے پر بیچارہ سائیس نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ آج میں سردار چوک کے نکڑ پر چھوٹی ہوٹل میں بیٹھا بار بار اپنی جواب طلبی کا لیٹر دیکھ رہا تھا جو مجھے کل ہی میری پانچ سال کی نوکری میں محو ہو کر کام کرنے کے صلے میں ملا تھا۔

مجھے بار بار وہ فقران یاد آ رہے ہیں جو سگریٹ تو بہت شوق سے پیتے ہیں مگر سگریٹ پیتے وقت بار بار یہی کہتے ہیں خدا ہمیں اس آفت سے چھٹکارا دے۔ ہوٹل کے چھوکرے میرے سامنے چائے لا کر رکھی تو میری سوچوں کا بند ٹوٹا۔ اچانک میری نظر گرو پر پڑی۔ ننگے پاؤں، بالوں میں کئی ہفتوں کی اٹی میل، بدن پر پھٹی پرانی قمیص اور سرخ جیکٹ پر میل کے دھبے کسی مزدور یونین کے جھنڈے کا تاثر دے رہے تھے۔ وہ ہاتھوں کو منھ کے قریب لے جا کر اپنی گرم سانسوں سے حرارت حاصل کر رہا تھا۔ ابھی وہ دھوپ سینکنے کے لیے ہوٹل کے سامنے بیٹھے

ہی والا تھا کہ ماما موچی کی آواز آئی۔

"گرو یار، ذرا ٹل سے بالٹی اٹھا لے آؤ"

گرو یہ سنتے ہی اتنا خوش ہوا جیسے کسی گریجویٹ کو کلرک کی نوکری مل گئی ہو۔ گرو نے فوراً سے وزن دار بالٹی لنگڑاتے ہوئے موچی کے اوزاروں کی پیٹی کے قریب لا کر رکھ دی۔ موچی نے بڑے محتاط اور میٹھے لہجے میں کہا:

"بیٹا اب ذرا تھڑے پر چھڑکاؤ کے ساتھ جھاڑو بھی پھیر دو اور جب یہ کام ختم ہو جائے تو چائے کا آرڈر دے کر آ جانا"

یہ تمام کام گرو بغیر کسی وقفے کے تمام کرنے کے بعد چائے کا آرڈر دے آیا اور موچی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ موچی نے جیب سے سستے سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر گرو کو ایک سگریٹ پکڑایا۔ گرو اتنا خوش ہوا جیسے کسی شوگر کے مریض کو کوئی لڈو کھانے کی پیش کش کر دے۔ ابھی گرو نے چائے کی چند چسکیاں بھری ہی تھیں کہ دوسری طرف سے مانو درزی صرافہ بازار کی خاتون اوّل کی طرح چیخ اٹھ کر با آواز بلند کہنے لگا:

"گرو جان، ذرا چاچو ہوٹل والے کو مرے نام کی اچھی سی چائے کا آرڈر دے آؤ"

گرو دوڑتے ہوئے چائے کا آرڈر دے آیا۔ ابھی وہ دوبارہ موچی کے قریب بیٹھ کر سگریٹ جلانے ہی والا تھا کہ قریبی رہائشی حصے سے کچھ خواتین نمودار ہوئیں۔

اشرف پہلوان نے گرو کو دھتکارتے ہوئے کہا، "اڑے او گرو، ذرا اپنی باجی کے لیے رکشہ لادو"

گرو اٹھا اور تیزی سے اگلے چوک کی طرف بڑھنے لگا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ایک رکشہ آ کر خواتین کے قریب رکا۔ گرو رکشے کے پاس کھڑے ہو کر خواتین کو پر مسرت انداز میں دیکھنے لگا۔ خواتین گرو کی طرف دیکھے بغیر رکشہ میں بیٹھ گئیں۔ گرو آستین سے ناک پونچھتے ہوئے اشرف پہلوان کے سامنے آیا جو کرسی لگا کر جمعہ پرچون والے کی دکان کے سامنے بڑے دبدبے سے بیٹھا ہوا تھا۔ تحکم سے بولا:

"اپنا منحوس سایہ ہٹاؤ، یہاں میرے دائیں جانب آ کر بیٹھو۔"

اشرف پہلوان کے کرخت لہجے کا گرو نے بالکل برا نہیں منایا اور پگلوں کی سی ہنسی کے ساتھ اشرف کے پہلو میں سہم کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جمعہ دکاندار سودا سلف سے بھرا پیکٹ اشرف پہلوان کے قریب رکھتے ہوئے بولا:

"پہلوان چینی دس کے بجائے پانچ کلو دے رہا ہوں۔ شام تک چینی کی بوریاں آ جائیں گی تو ــــــ"

"ٹھیک ہے باقی سودا تو پورا ہے نا ــــــ"

"جی ــــــ جی"

"اچھا یوں کرنا کہ شام کو چینی آ جائے تو پانچ کلو گرو کو دے دینا وہ گھر پہنچا دے گا۔"

"جی بہتر"

اشرف پہلوان نے گرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "یہ گھر میں دے آؤ اور سنو گھر والوں سے ماسٹر کے وی سی آر کا کیسٹ لیتے آنا۔"

گرو فوراً سامان اٹھا کر مستعدی دکھاتے ہوئے وزن کے بوجھ تلے بغیر لڑکھڑائے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر پہلوان کو ویڈیو کیسٹ دکھاتے ہوئے ماسٹر کی دکان میں داخل ہوا۔ جب دکان سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔ اب وہ دکان کے سامنے جھاڑو پھیرنے لگا۔ ابھی اس نے اچھی طرح صفائی بھی نہیں کی تھی کہ ماسٹر نے اسے وی سی آر لے جانے کا حکم دیا اور کہا گرو یار، یہ ذرا تھانیدار صاحب کے گھر تک پہنچا دو۔

گرو وی سی آر بھی پہنچا کر آیا وہ کام کی ذمہ داریوں میں پوری تندہی اور لگن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید متحرک ہوا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا اتنا کام کرنے والا بندہ کوئی نوکری کیوں نہیں کرتا۔ ایک بوڑھا بلوچ میرے قریب ہی بیٹھا چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے یہ تمام کاروائی دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس سے گرو کے بارے میں پوچھا۔

وہ کہنے لگا، ''اس کا نام گرو ہے۔ یہ ایک چائے کی پیالی اور سگریٹ پر مشکل سے مشکل کام بھی کر لیتا ہے۔''

''رہتا کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''اب تک تو اس کا کوئی مخصوص ٹھکانا نہیں۔ گرو کا باپ ٹرک ڈرائیور تھا۔ ایک قبائلی جھگڑا ہوا۔ حریفوں نے راستے میں اس کے ٹرک کو گھیر لیا اور اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ ماں یہ دکھ برداشت نہ کر سکی۔ وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ قبیلے والوں کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے یہ نوجوان شہر آیا اور تب سے یوں ہی دن گزار رہا ہے۔''

''یہ کوئی ملازمت کیوں نہیں کر لیتا؟''

''لوگوں کا اس کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ یہ خبطی ہے اور دوسری بات یہ کہ کوئی اس کا ضامن ہونے کو بھی تیار نہیں۔''

اچانک میں نے دیکھا کہ سامنے بینک کا منیجر گرو کو بلا رہا ہے۔ منیجر نے ابھی ریڑھی والے سے کچھ سبزیاں پھل وغیرہ خریدے تھے۔ وہ گرو کو گھر لے جانے کے لیے دے دیتا ہے۔

گرو جی صاحب کہہ کر گنگناتے ہوئے چل پڑتا ہے۔ میں رات کو گرو کے بارے میں سوچنے لگا اچانک مجھے میری ایکسپلینیشن کال یاد آئی۔ میں دوبارہ اس کی فکر میں پڑ گیا میں اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ صبح ناشتہ کرنے کے لیے دوبارہ ہوٹل میں آیا تو میں نے دیکھا حسب معمول روز کی طرح سب گرو کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اچانک دوسری جانب سے ہتھکڑیوں کی آواز پر میں چونک گیا دیکھا کہ تین چار پولیس والے گرو کو بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں۔ گرو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں پتہ میں بے گناہ ہوں۔ وہ پہلوان، موچی، ماسٹر، درزی سب کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بار بار یہی کہہ رہا تھا اور سب لوگ گرو سے نظریں چرا رہے تھے۔ موچی فوراً پانی اٹھانے کے لیے نل کی طرف دوڑ گیا، پہلوان پرچون کی دکان میں خوش گپیاں کرنے لگا، ماسٹر درزی چائے کا آرڈر دینے کے لیے ہوٹل کی

جانب بڑھا۔ ماسٹر ویڈیو سینٹر کے سامنے مجمع زور پکڑنے لگا۔ میں وجہ معلوم کرنے کے لیے پولیس والوں کے پیچھے تھانے کے قریب پہنچا ایک سنتری اپنے حوالدار سے کہہ رہا تھا کہ "سر! مجمع سے خیال میں بہت مشغل ہو گیا۔ اب اسے چھوڑ دیتے ہیں" جب انہوں نے گرو کو چھوڑا تو میں نے دیکھا کہ وہ اُدھر وہیں بیٹھ کر منھ چھپائے رو رہا ہے۔ میں اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے جواب طلبی کا لیٹر جمع کرانے کا خیال آیا اور میں اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا

عارف ضیاء

بارش کی دعا

وہ شاید قبولیت کا لمحہ تھا۔ بادلوں نے اس کی آواز سن لی تھی۔ بے کسی اور بے بسی کی پھٹی پرانی چادر اوڑھے وہ معصوم روح اس فضائے بسیط میں شاید اپنی آواز کی گونج سننا چاہتی تھی جہاں اس کی دھیمی اور مدھم آواز قریبی فاصلوں تک کو ناپنے سے قاصر تھی مگر پھر بھی وہ اس بازگشت کے انتظار میں کھڑی تھی جو سارے جہاں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

فلک بوس عمارتوں کے اس میلوں پھیلے شہر میں کسی کھلے میدان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شہر کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زمین سکڑ گئی ہو۔ میدانوں کی ناپیدی کی بنا پر محلّے کے بچے چوراہوں پر یا اپنے گھروں کے سامنے ان تنگ گلیوں میں جہاں سورج کی روشنی کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ کرکٹ اور ہاکی کھیلنے پر مجبور تھے۔ ہاں البتہ شہر میں جا بجا ایسے خالی پلاٹ ضرور موجود تھے جن کے دولت مند مالک ان پلاٹوں پر یا تو شاپنگ پلازہ تعمیر کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے یا پھر ان کی قیمتیں چڑھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تاکہ ان پلاٹوں کو دگنی تگنی قیمت پر فروخت کر کے اچھا خاصا منافع کما سکیں۔

ایسے پلاٹوں پر اکثر بے خانماں لوگ جھگی بنا کر رہائش پذیر ہوئے۔ اور وہ روزانہ سونے

سے پہلے یہ دعا ضرور کرتے کہ اگلی صبح پلاٹ پر کسی عمارت کی تعمیر شروع نہ ہو۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں انہیں پلاٹ بدر ہونا پڑتا۔

ننھی زبیدہ، جس کی بیوہ ماں اسے زیبو کہہ کر پکارتی تھی، اس قسم کے ایک پلاٹ میں ساتھ والی چھ منزلہ عمارت کے سائے تلے ایک جھگی میں رہتی تھی۔ یہ پلاٹ ایک ریٹائرڈ کسٹم انسپکٹر کی ملکیت تھا۔ جو شاید پلاٹ کی قیمت فروخت میں خاطر خواہ اضافے کا منتظر تھا۔ زیبو کی عمر اس وقت چھ سات برس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا باپ اس کی پیدائش سے ایک سال بعد چل بسا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد جوں ہی آمدنی کا سلسلہ بند ہوا تو مالک مکان نے ماہوار کرایہ حاصل نہ ہونے کے خدشات کے پیش نظر زیبو کی ماں کو مکان بدر کر دیا۔ وہ بے چاری معصوم زیبو کو سینے سے لگائے کچھ عرصے تک دور کے رشتہ داروں کے ہاں دن گزارتی رہی۔ لیکن کسی رشتہ دار نے اسے ہفتے یا دو ہفتے سے زیادہ اپنے گھر میں رکھنا گوارا نہ کیا۔ اپنے سرتاج کی زندگی میں عزت و آسودگی سے اپنے گھر میں رہنے والی عورت بالآخر کھلے آسمان تلے پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے ریٹائرڈ کسٹم انسپکٹر کے پلاٹ پر چھ منزلہ عمارت کے سائے تلے ایک جھگی ڈالی۔ اور زیبو کے ساتھ زندگی کے مصائب و آلام جھیلنے پر کمربستہ ہوگئی۔ وہ آس پاس کی کوٹھیوں میں جا کر محنت مزدوری کرتی۔ اور معاوضے کے طور پر ان گھروں کا بچا کھچا کھانا، ان کی اترن اور ماہوار چند روپے بطور تنخواہ وصول کرتی۔ اس طرح زندگی کے ماہ و سال گزرنے لگے۔ دودھ پیتی زیبو اپنے بچپن اور اس کی ماں بڑھاپے کا سفر طے کرتے رہے۔ اس دوران مالک پلاٹ نے پلاٹ پر ماں بیٹی کے مستقل ناجائز قبضے کے خطرے کے پیش نظر انہیں پلاٹ بدر کرنے کے متعلق سوچا بھی۔ لیکن شاید اسے اس امر کا یقین ہوگیا تھا کہ ایک تنہا اور کمزور سی عورت اس کے پلاٹ پر مستقل طور پر ناجائز قبضے کی قدرت نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس نے پلاٹ کی چوکیداری کے لیے جھگی کو پلاٹ پر برقرار رہنے دیا۔

وہ جمعے کا دن تھا۔ آسمان پر صبح سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ان بادلوں سے بارش کی ایک بوند بھی نہیں برسی تھی۔ ایسا گزشتہ چند ماہ سے ہو رہا تھا۔ گہرے بادل آسمان پر چھا

جاتے۔ لیکن بات معمولی بوندا باندی تک محدود رہ جاتی۔ جب کہ ضرورت اس امر کی تھی کہ متواتر اور موسلادھار بارش ہو۔ خشک سالی دنوں کے لئے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکی تھی۔ آج زیبو کی ماں کو بخار تھا۔ اس لیے وہ کام پر جانے کے بجائے اپنی کٹیا ہی میں پڑی رہی۔ زیبو جھگی کے سامنے کھیل رہی تھی۔ جمعہ کی نماز کے کچھ ہی دیر بعد لوگوں کا ایک جلوس پلاٹ میں وارد ہوا۔ جلوس کے شرکاء کی تعداد اگر ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں ضرور تھی۔ جس میں ہر طبقے اور ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے۔ ننھی زیبو نے لوگوں کے اس ہجوم کو دیکھ کر کھیل بند کر دیا تھا اور جھگی میں لیٹی ماں کے پاس آ گئی تھی۔ امی ہمارے گھر بہت سے لوگ آئے ہیں، اس نے معصومیت سے کہا۔ بچی، یہ لوگ نماز استسقاء پڑھنے آئے ہیں، ماں نے جواب دیا۔ لیکن زیبو نماز استسقاء سے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں ماں نے اسے بتایا کہ یہ لوگ جب نماز پڑھ کر اللہ میاں سے دعا کریں گے تو بہت زور کی بارش ہوگی جس سے زمین سیراب ہو کر اچھی اور زیادہ فصل دے گی۔ ممکن تھا کہ زیبو کوئی اور سوال کرتی لیکن ماں نے اسے باہر جا کر جھگی کے سامنے کھیلنے کو کہا۔ وہ جھگی سے باہر زمین پر بیٹھ گئی، "جب یہ لوگ نماز پڑھ کر دعا کریں گے تو بہت زور کی بارش ہوگی۔" ماں کے کہے ہوئے الفاظ اس کے ننھے ذہن میں گونجنے لگے اور پھر اسے گزشتہ برس کا وہ دن یاد آ گیا جب بہت زور کی بارش ہوئی تھی اور پلاٹ کا تمام پانی ان کی جھگی میں بھر گیا تھا۔

دونوں ماں بچی مختلف اطراف سے پلاٹ میں جمع ہونے والے اور جھگی کی بوسیدہ چھت سے ٹپکنے والے پانی میں گھنٹوں بھیگتی رہی تھیں۔ اس کے معصوم ذہن پر ایک خوف سا چھا گیا اس نے خوف زدہ نگاہوں سے لوگوں کو دیکھا۔ مولوی صاحب ہاتھ بلند کر کے اللہ میاں سے زوردار بارش کی دعا کر رہے تھے اور اجتماعی آمین آمین کا ورد کر رہے تھے۔ ننھی زیبو کو نہ جانے کیا سوجھی، اس نے بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھ فضا میں دعائیہ انداز میں بلند کر دیے۔ اور دعا کی، "اللہ میاں بارش مت کرنا۔ میں اور میری ماں بارش میں بھیگ جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ اماں بہت بیمار ہیں۔ ان کو صحت دے دو۔ ہم یہاں سے کسی محفوظ جگہ چلے جائیں گے اور پھر

سب کے ساتھ بارش کی دعا مانگیں گے۔ اللہ میاں ابھی بارش مت کرنا، مت کرنا۔" قبولیت کا لمحہ جیسے معصوم زینو کی کھلی ہوئی ہتھیلیوں میں سمٹ آیا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے خلا کو تکتی رہی۔ جھگی کی طرف چل پڑی۔ جب امام اور مقتدی دعا کر چکے تو دفعتاً موسم بدلنے لگا۔ گہرے سیاہ بادلوں میں شگاف پڑ گیا۔ کچھ دیر میں آسمان بادلوں سے پوری طرح صاف ہو چکا تھا اور سورج پوری آب و تاب سے ساتھ اپنی چمک دکھا رہا تھا۔

عارف ضیاء

چرواہے کے لوک گیتوں کی محبوبہ

میں پہاڑی سے نیچے اترتے وقت پتھریلی ڈھلوان پگڈنڈی پر احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے دور بستی کی طرف گامزن تھا، لیکن میرا ذہن اس غار کے اسرار کی گتھیاں سلجھانے میں لگا ہوا تھا جس میں کچھ دیر قبل داخل ہو کر میں نے اس کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ یہ غار پہاڑی میں کچھ بلندی پر واقع تھا۔ اس غار کے حوالے سے پُراسرار باتیں آس پاس کی بستیوں میں مشہور تھیں جو آہستہ آہستہ شہر تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ اور جب یہ مجھ تک پہنچیں تو مجھے اس غار کو اندر سے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ میری جستجو والی رگ پھڑک اٹھی۔ اسی نتیجے میں اس پہاڑی تک جا پہنچا۔ اس غار کے متعلق شاید ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ اور بساط کے مطابق ایک من گھڑت کہانی مشہور کر دی تھی۔ کچھ لوگوں کے مطابق یہ غار زمانہ قدیم میں ڈاکوؤں کے ایک خطرناک گروہ کا مسکن رہی تھی۔ جبکہ کچھ لوگ اسے ماضی میں جن تمام کا ڈیرہ سمجھتے تھے۔ میں نے اس غار کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد باتوں کو رد کر دیا تھا کیونکہ غار میں مجھے نہ تو انسانوں کے قیام کے آثار دکھائی دیے تھے اور نہ ہی ایسے شواہد ملے تھے جن سے غار میں غیر مرئی قوتوں کے مسکن ہونے کا ثبوت ملتا۔ اس لئے میں اس غار کو محض ایک عام سے غار سے زیادہ کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہ

تھا۔ میں نے پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے پلٹ کر ایک بار پھر بلندی کی طرف دیکھا۔ غار کے دہانے کے قریب گون کے دو درخت کافی فاصلہ ہونے کی وجہ سے نہایت چھوٹے نظر آرہے تھے۔ ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق رکھنے والے دو پہریداروں کے دھندلے عکس کی مانند یا پھر غار کے دہانے پر کھڑے ہو کر بستی کا جائزہ لینے والی دو بدروحوں کی طرح اب میں چلتے چلتے پہاڑی کی ایک تنگ سی گھاٹی میں اتر گیا تھا جہاں سے پہاڑی کے دامن اور بستی کا منظر کچھ دیر کے لیے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسی لمحے میری سماعت سے ایک مانوس لوک گیت کی آواز ٹکرائی۔ لوک گیت کے مخصوص بولوں کی خوبصورتی اور گانے والے کی آواز کی شیرینی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں گھاٹی سے نکل کر سیدھی اور ڈھلوان پگڈنڈی پر آیا تو میں نے اپنے دائیں جانب دامنِ کوہ میں ایک چرواہے کو بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے دیکھا جو اونچی آواز میں لوک گیت گا رہا تھا۔ گیت کے دل کش اور مسحور کن بولوں میں محبوبہ کے حسن کی تعریف و توصیف کی گئی تھی محبوبہ یہ لفظ ایک تکرار کے ساتھ میرے ذہن میں گونجنے لگا پتہ نہیں اس مفلوک الحال چرواہے کی محبوبہ کا حقیقتاً کوئی وجود ہے بھی یا نہیں میں سوچنے لگا اگر اس چرواہے کی کوئی حقیقی محبوبہ ہے تو وہ کس بستی کی چنچل اور الہڑ دوشیزہ ہوگی ایسی خوبرو حسینہ جس کی چال ہرنی جیسی قلانچیں بھرتی جھیل سی خوبصورت اور گہری آنکھیں جن میں ڈوبنے والا کبھی کنارے سے ہمکنار نہ ہو سکتا جس کی سیاہ ریشمی زلفیں اتنی دراز اور گھری ہوں کہ وہ گرمی کی آگ برساتی دوپہر میں اپنی زلفیں بکھیر کر محبوب کے سر پر ایک سائبان تان دے۔ جب یہ خوبرو دوشیزہ چاندنی راتوں میں کھلے آسمان کے نیچے آتی ہوگی تو چودھویں کا چاند شرما کر کسی آوارہ بادل کے پیچھے چھپ جانے کی کوشش کرتا ہوگا۔ خوبصورت چہرہ یاقوتی دانت گلابی ہونٹ اور رخسار کنول سے۔ آنکھیں روشن کمان، آبرو، ستوان ناک اور تاج محل جیسا اچھوتا بدن نہیں اس روئے زمین پر ایسی محبوبہ دلنواز کا تصور تو کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقتاً اس کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی ایسی دلکش اور خوبرو محبوبہ کا وجود نہیں ہے تو تصورات کو حقیقت کا

رنگ دینے سے کیا حاصل لیکن چرواہا میری سوچوں سے بے نیاز اپنی محبوبہ کے لیے گیت گانے میں مگن تھا میری محبوبہ تیرے رنگ ہزار ہیں سفید سرخ سبز گلابی کہکشاں کے رنگوں کی طرح تیرا دل میرے لیے اپنی محبتیں اور چاہتیں نچھاور کرتا ہے جب تو مجھے اپنے سینے پر سلا کر لوری سناتی ہے تو مجھے بہت سکون ملتا ہے تو دل گہرائیوں سے چاہنے والی ہے اور محبت کرنے والی ہے ماں کی طرح میری محبوبہ تو اتنی حسین ہے کہ بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں جھک کر تیرے حسن اور دلکشی کا نظارہ کرتی ہیں آکاش تیری چنری بنتا ہے اور سمندر اور دریا تیرے پیر چھوتے ہیں میری محبوبہ مجھے یقین ہے کہ تو مجھے ایک نہ ایک دن ضرور اپنی بانہوں میں لے کر بہت سا پیار دے گی

چرواہا گیت گاتا ہوا مجھ سے بہت دور چلا گیا لیکن میرا ذہن اس کے لوک گیت کی محبوبہ میں الجھا رہا۔ اب میں بستی کے مضافات میں پہنچ گیا تھا۔ میرے سامنے سرسبز و شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ میں ستانے کے لیے پگڈنڈی کے پاس کاریز کے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ کاریز کے کنوئیں مخصوص فاصلوں پر ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ پہاڑ کے دامن سے نہ جانے کہاں تک تاحد نگاہ ان کنووں کی کھدائی سے برآمد ہونے والے مٹی کے ڈھیر اس تسلسل کا ثبوت دے رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے میں حقیقت عالم پر غور کرنے لگا وسیع و عریض زمین بلند و بالا پہاڑ دریا سمندر زمین پر چلنے اور رینگنے والے جانور اور آسمانوں میں پر پھیلائے اڑنے والے پرندے ہر شے انسان کو دعوت فکر دیتی ہے اور ہر شخص اپنی ذہنی قوت اور استعداد کے مطابق غور و فکر کرتا ہے لیکن کیا کوئی شخص تخلیق عالم کے اسرار اور گہرائیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا ہے نہیں اسرار عالم تا حال سربستہ ہیں تخلیق کے حقیقی رموز سے خالق ہی آشنا ہے میری نظر سامنے پھیلے ہوئے پتھریلے میدان میں چند معصوم بچوں پر پڑی جو ننگے پاؤں بوسیدہ لباس پہنے مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جمع کر کے انہیں اپنی کمر پر باندھے ہوئے زنبیل نما چادروں میں ڈال رہے تھے۔ یہ لکڑیاں یقیناً ان کے گھروں میں آگ جلانے کے لیے استعمال ہوتی ہوں گی ''بچے پھول ہوتے ہیں'' میرے ذہن

کے گوشے میں ایک آواز ابھری ۔ کیا یہ پھول جیسے بچے اس مشقت کے متحمل ہو سکتے ہیں
قطعاً نہیں یہ پھول قطعاً خزاں سے پہلے مرجھانے کے لیے نہیں ہیں لیکن یہ کلیاں
یہ پھول کسی چمن زار میں شاخ پر کھلنے والے نہیں بلکہ ویرانوں میں اپنی بہار دکھانے والے پھول
ہیں جو تیز و تند ہوا کا نہ صرف مقابلہ کرتے ہیں بلکہ موسموں کے تغیر سے بے نیاز اپنی مستی اور
سرشاری میں جھومتے رہتے ہیں اگر ان پھولوں کی صحیح آبیاری ہو تو پورے گلشن کا رنگ اور خوشبو
سے مہک سکتا ہے میں نے ایک بار پھر ان بچوں کی جانب دیکھا جو مجھ سے اور میرے
خیالات سے بے نیاز اپنی مشقت میں مگن تھے میں نے دور تک پھیلی زمین کو دیکھا اور
اس کی وسعتوں پر غور کیا انسان چاند اور مریخ کے رازہائے سربستہ سے پردے اٹھا رہا ہے،
خلاؤں کے اسرار کھلتے جا رہے ہیں، فاصلے سمٹتے جا رہے ہیں منزلیں قریب تر ہوتی جا رہی
ہیں۔

ماضی کا انسان اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھا اس لیے وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو
بے نقاب نہیں کر پایا تھا لیکن آج کا انسان سائنسی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کے باوجود
مقصد تخلیق عالم سے ناآشنا ہے وہ جس زمین پر رہتا ہے اسے اس کے متعلق ہی علم نہیں کہ
اسے کیوں تخلیق کیا گیا لیکن وہ چرواہے کے لوک گیت والی محبوب وہ کہاں ہوگی اسی
زمین پر یا پھر مریخ یا چاند پر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا لیکن خود اپنے سوال کا جواب
نہ دے سکا شاید وہ چرواہا بھی اس سوال کا جواب نہ دے سکتا ہو یہ سوچ کر میں کنویں کی
منڈیر سے اٹھا اور بستی کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر بعد میں سرسبز کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر
قدم بڑھا رہا تھا سرسبز و شاداب کھیت جو بستی کے محنت کش کسانوں کی محنت کا ثمر تھے زمین
سونا اگل چکی تھی جس کا رنگ سبز تھا کہکشاں کے رنگوں میں سے ایک رنگ اور پھر اچانک
میرے ذہن کا ایک دریچہ کھلا دھرتی دھرتی انسان کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے
دھرتی دل کی گہرائیوں سے محبت کرنے والی ہے ماں کی طرح اب میں نے چرواہے کے
لوک گیت کے بولوں کے پس منظر میں ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا پہاڑوں کی چوٹیاں

جھک کر دھرتی کے حسن کا نظارہ کر رہی تھیں ۔ آکاش دھرتی کی نیلی چنری کی طرح اس کے سر پہ تنا ہوا تھا۔ میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ دریا اور سمندر بے قرار ہو کر دھرتی کے دودھ جیسے سفید پیر چھو رہے تھے   دھرتی کے رنگ مختلف تھے   کہیں سبز کہیں سفید   کہیں زرد   کہیں گلابی   کہکشاں کے رنگوں کی مانند   گویا مجھ پہ چرواہے کے لوک گیت کے اسرار کھلنے لگے

دھرتی صرف ماں ہی نہیں بلکہ چرواہے کی لوک گیت والی حسین اور خوبرو محبوبہ بھی ہے جو گرمیوں کی گرم دوپہر میں اپنی دراز اور گھنی زلفیں پھیلائے اپنے محبوب کے سر پہ ٹھنڈی چھاؤں کرتی ہے۔ بے شک دھرتی ہی وہ محبوبہ ہے جو ایک نہ ایک دن اپنے محبوب کو اپنی آغوش میں لے کر بہت سا پیار دے گی دھرتی موت کے بعد انسان کے بے روح جسم کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں چھپا لے گی۔

اثیر عبدالقادر شاہوانی

ڈاکٹر

گوریچ کی یخ بستہ ہوا جسموں کو کاٹتی جا رہی تھی۔ زمین پر پاؤں رکھنا محال تھا۔ اونچی نیچی راہیں اور ان راہوں پر پڑی ہر چیز برف ہو چکی تھی۔ سمی کی ہلکی سی چادر گیلی ہو چکی تھی جانے کب سے جگہ جگہ سے پھٹے کپڑوں سے یخ بستہ ہوا جسم کو چھوتے ہی بے سدھ کر چکی تھی۔ ننگے پاؤں سردی سے تقریباً سوج گئے تھے اور ناخن رنگ بدل چکے تھے۔ آنسو زمین پر ژالہ بن کر گر رہے تھے۔ زبان ساتھ دیتی تھی نہ الفاظ۔ ہاتھ حرکت کی خواہش سے ہی جیسے محروم ہو گئے تھے

بیل کی پیٹھ پر ایک پرانی رلی میں لپٹا اس کا شوہر ادھر ادھر گرا جا رہا تھا۔ سمی بڑی مشکل سے اپنے لاغر اور شدید بیمار شوہر کو ڈاکٹر کے پاس لائی۔ ڈاکٹر کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ گاڑیاں اور آ رہی تھیں۔ گاڑیوں کی آوازوں نے اسے بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا تھا۔ بیل گھبرا کر اچھلنے لگا۔ اس کے اچھلنے سے مریض شوہر اچانک بیل سے یخ بستہ زمین پر آ گرا۔ ہائے کی آواز کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ بیل گاڑیوں کے ہارن اور انجن کی آوازوں سے گھبرا گیا اور بدکنے لگا۔

سمی نے بشام کو سنبھالا دیا۔ اس کے زخموں پر سے خون صاف کر کے اپنے دوپٹے سے

پٹی کر دی۔ اس کا بچہ بے تحاشا رو رہا تھا۔ دوسری طرف ہشام کی ہائے ہائے نے مل کر سمتی پر زمین تنگ کر دی تھی۔ اس کا دوپٹہ سامنے پڑا تھا ۔ اس وقت اسے فورتج کے سرد تھپیڑوں کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا وہ سردی سے بے نیاز سی ہو گئی تھی۔

اچانک اسے گاڑیوں کے مسلسل ہارن بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ گاڑیوں کی ایک لمبی قطار آگے پیچھے کھڑی مسلسل ہارن بجاتے ہوئے جیسے کہہ رہی ہے، "جلدی کرو لاشوں کو سڑک سے ہٹا دو۔" سمتی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ہشام کو اٹھا کر راستہ صاف کرے اور بچے کو خاموش کرائے ۔ وہ بے بسی سے گاڑیوں میں بیٹھے ہوؤں کو دیکھنے لگی تو ان کی طرف سے سمتی کو غصے سے بھری جیسے آوازیں سنائی دیں، "جلدی اٹھاؤ ان نیم مردوں کو ۔" سمتی ہشام اور بچے کو دیکھے جا رہی تھی۔ دل اور نظروں میں ایک آگ سی جل اٹھی تھی مگر وہ بے بس اور حیران تھی کہ وہ کیوں کچھ نہیں کر پا رہی۔ اس دوران سامنے کی گاڑی سے ایک موٹا آدمی اترا اور سمتی کے قریب آ کر اسے ڈانٹتے ہوئے ہشام کو پاؤں سے گھسیٹ کر کنارے پر ڈال کر کہنے لگا، "دیکھ نہیں رہی ہو، میر صاحب کو زکام ہے اور تم سڑک کے درمیان ٹھکانہ بنا کر بیٹھی ہو اور راستہ نہیں دے رہی ہو۔ یہ بچہ اٹھا ورنہ کچل کر گزر جائیں گے، اس برف کی طرح۔" یہ کہتے ہوئے موٹا شخص گاڑی کی طرف چل پڑا۔ سمتی نے لپک کر بچے کو بازوؤں میں سمیٹا اور ہشام کے قریب کھڑی ہو گئی۔ بچے کو ہشام کے قریب لٹا دیا۔ گاڑیوں کی قطار گزرنے لگی۔ ہشام تقریباً ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ چوٹ اسے بری طرح نقصان پہنچا چکی تھی اس پر برف اور سردی کی شدت اسے موت کے قریب کر چکی تھی۔ مگر وہ بچے کو دیکھنے لگی۔ وہ تو سانسوں کے آزاد سے آزاد ہو چکا تھا۔ آنکھیں اور منہ بند ہو چکے تھے۔ سمتی بچے کو ہشام کے پہلو میں رکھ کر دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس گئی اور رو رو کر کہنے لگی، "میرا شوہر باہر سڑک پر آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کوئی ہے جو اسے برف اور سردی سے اٹھا کر یہاں لے آئے۔" ڈاکٹر نے شاید اس کی بات نہیں سنی مگر ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا، "رہنے دو یہ کوئی پاگل لگتی ہے۔ سڑک کے درمیان بیٹھی تھی۔ ہمیں اور میر صاحب کو بلاوجہ دیر کرا دی۔" سمتی نے فریاد کرنے کے انداز

میں کہا، "ڈاکٹر خدا کے لیے۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ بیل ڈر کر بھاگ گیا۔ میرا بچہ سردی کی وجہ سے مر گیا۔ اب میرا شوہر شدید زخمی حالت میں سڑک کے کنارے پڑا ہے۔ میرا اس کے سوائے اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ڈاکٹر تمہارے لیے سب انسان برابر ہیں تمہیں اپنی اولاد کا واسطہ میرے شوہر کو یہاں لے آؤ اور اس کا علاج کر دو۔

"سکی کی ان باتوں سے سب کے موڈ خراب ہو گئے۔ ڈاکٹر کہنے لگا" غریب تم خدا کی طرف سے ہوتی ہو۔ یہ گلہ اپنے خدا سے کرو تمہارے شوہر کو اٹھا کر لانے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں۔ یہ میرے مریض اور ان کے خاندان کے لوگ بیٹھے ہیں۔ تمہارے نوکر نہیں جا کر باہر بیٹھ جاؤ۔ میں میر صاحب سے فارغ ہو کر تم سے بات کروں گا چلو جاؤ باہر!" سکی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈاکٹر اس کے بچے کی موت اور شوہر کی شدید زخمی حالت کے باوجود اس قدر سخت لہجے میں بات کرے گا۔ ڈاکٹر کی باتیں بار بار اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ بے چین سی ہو گئی اور یا حسین کہتی ہوئی دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ خدا کے لیے برف میں گرا ہوا یہ زخمی شخص اور کسی گرم کمرے میں بیٹھا ہوا شخص دونوں ہی انسان ہیں اور برابر ہیں کوئی کتے کو بھی اس حالت میں دیکھے تو اس کا دل پسیج جاتا ہے مگر یہ ڈاکٹر کے معاون نے اسے زبردستی باہر نکالا۔ اس کا دوپٹہ ڈاکٹر کے کمرے میں رہ گیا۔ زار و قطار رونے اور فریاد کرنے سے وہ نڈھال سی ہو گئی۔ آنکھیں درد و غم کی تصویر بن گئیں۔ دوسرے لمحے وہ پھر ڈاکٹر کے کلینک کی طرف چل دوڑی اور جاتے ہی ڈاکٹر کے پاؤں پڑ گئی اور کہنے لگی، "خدا کے لیے میرے شوہر کو بچا لو۔ اسے کم از کم برف سے اٹھا کر یہاں لے آؤ" ڈاکٹر نے وہی پہلے والا جواب دیا، "تم باہر رہو میں اپنے معزز مریضوں کو چیک کرنے کے بعد تم سے بات کروں گا۔" اس سے پہلے کہ سکی کچھ اور کہتی، معاون نے اسے باہر نکال دیا۔ سکی ڈاکٹر سے مایوس ہو چکی تھی۔ شوہر کی موت نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس کا ان کے سوا دنیا میں کوئی اور نہیں تھا۔ وہ زور زور سے ڈاکٹر، ڈاکٹر کہتی ہوئی دوڑنے لگی شاید اتنی دور کہ اسے کہیں کوئی انسان نظر نہ آئے!

افضل مراد

گم شدہ خطوط

''میں اب سانسوں کی قید سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ اس بے مقصد اور بے ترتیب زندگی کا میرے پاس کوئی جواز، کوئی معنی نہیں۔ اب میں مرنے جارہی ہوں'' اخبار کی روز آنے والی ڈاک کھولتے ہوئے مریم کی تحریر پہچانتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کا خط کھول کر پڑھنا شروع کیا ''سر، میں نہیں سمجھتی کہ ڈاک کے محکمے کی نالائقی کی وجہ سے میرے خطوط آپ تک نہیں پہنچ پار ہے۔ بہر حال یہ میرا آخری خط ہوگا میں نے اپنا کیس اب کسی اور عدالت کے حوالے کرنے فیصلہ کرلیا۔ میں نے نوکری چاہی تھی۔ بابا کے خوابوں کی تعبیر بننے کی کوشش کی تھی۔ اپنے اندر آج کی پڑھی لکھی اور باشعور عورت کی آواز کو جگایا تھا لیکن اس کے جواب میں آپ کی سوسائٹی نے مجھے عزت سے محروم کیا۔ مجھ پر کرپٹ اور بدچلن ہونے کا الزام لگایا۔ میرے پیارے اور محبت کرنے والے بابا کی زندگی چھین لی صرف اور صرف اس لیے کہ میں شریف باپ کی بیٹی تھی۔ غربت کے باوجود ذہین تھی خوبصورت تھی۔ اپنے لباس اور تراش خراش کا خیال رکھتی تھی۔ مرد کی گندی نظروں اور ان کی بے ایمان خواہشوں سے خود کو دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔''

مریم نے مجھے شاعر اور ادیب ہونے اور ایک نظریاتی سوچ رکھنے والے صحافی کی حیثیت سے پہچانا تھا۔ میرے اخبار کے مضامین اور سروے پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ خواتین کے موضوع پر میرے تاثرات اور حقوق کی نشاندہی پر وہ بے ساختہ مجھے "عصر کے نمائندے" کا خطاب دیتی تھی۔ دراصل ایک لکھنے والے کے لیے سب سے بڑی بات اس کے پڑھنے والوں کی داد اور پذیرائی ہے۔ میں ان خوبصورت اور نازک احساسات رکھنے والوں کی آراء، خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے جان کر اپنے اندر بڑی توانائی محسوس کرتا تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے مجھے پکی نوکری دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب میں میگزین سیکشن کے انچارج کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا۔ ان کاموں اور حالات حاضرہ کی رپورٹنگ نے میری تخلیقی صلاحیتوں کو بڑی حد تک نقصان پہنچایا تھا۔ کافی عرصے سے کوئی نظم یا افسانہ نہیں لکھ سکا تھا حالانکہ چند اچھے آئیڈیاز ذہن میں آ رہے تھے لیکن پکی نوکری کی ضرورت نے تخلیقی مواد کو سامنے لانے سے روک رکھا تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ۱۹۸۵ء میں میرا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ میں خوشی خوشی بابا کے پاس اپنی کتاب لے کر گیا۔ بابا نے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا تھا "بیٹا اس کتاب کو لکھنے کے کتنے پیسے ملے ہیں" لیکن اتنے برس گزرنے کے بعد میں اتنا سمجھ گیا تھا کہ کسی پکی نوکری اور چار پیسوں کے بغیر تخلیق کے کوئی معنی نہیں بنتے۔ اخبار کے صحافی اور اخبار کے دانشور کی بہت مانگ ہے۔ کسی بھی سیمینار، مذاکرے، ٹی وی پروگرام میں صحافی ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات کو لافانی اور آفاقی ثابت کرنے کے لیے بڑے بڑے مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ادبی صفحات کے رنگین ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ شہرت تخلیق سے بڑھ کر سورسز سے حاصل ہوتی ہے۔ اخباری محنت سے وابستگی کے باوصف غیر ملکی ثقافتی، ادبی اور صحافتی وفود میں دورے کی لاٹری نکلنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ خیر اب مزید تفصیل کیا بتاؤں۔ کچھ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔ آج شام کو مریم کا خط پڑھنے کے بعد میں اپنا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ اب آپ ہی بتائیے میں مریم کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ مریم نے اپنے پچھلے خطوط میں بھی خودکشی کی دھمکی دی تھی جو اس کے بقول ناکام خودکشیاں ثابت ہوئیں تھیں۔ مریم کا باپ ایک

کسان تھا۔ اس نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے مزدوری کر کے مریم کی تعلیم مکمل کرائی تھی۔ بی اے کرنے کے بعد مریم نے نوکری کے لیے محکمہ تعلیم میں کئی درخواستیں دی تھیں پرائیویٹ سکولوں میں معقول سی تنخواہ پر ٹیچنگ کے فرائض بھی انجام دیتی رہی تھی۔ وہ بابا کے مشورے سے وہ سرکاری اسکول میں پڑھانے اور مستقبل کے تحفظات کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر محکمے کے بااختیار افسران سے ملنے جاتی لیکن مایوس ہو کر لوٹ آتی۔

اپنے پرائیویٹ سکول میں ایک تحریری مقابلے میں مہمان بننے کے بعد میڈم نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اور اپنے پسندیدہ سیاسی پارٹی کے اجلاسوں میں خواتین کی طرف سے مریم کو بھجوانے کے بعد انہوں نے مریم کی مالی طور پر کچھ نہ کچھ مدد بھی کی تھی۔ مریم کا باپ نہ چاہتے ہوئے بھی مریم کو اجازت دے رہا تھا کہ اسی بہانے پارٹی کے وزیروں اور مشیروں کی سفارش سے مریم کو اچھی نوکری مل سکے گی۔ مریم کا گھر بس جانے کے بعد وہ خوشحال زندگی بسر کر سکے گی۔ علاقے کے بلدیاتی الیکشن میں میڈم کے پبلک اسکول کے تمام ورکنگ اسٹاف کے لیے الیکشن دفتروں سے گاڑیاں آتی جاتی نظر آئیں۔ مریم کو پہلی بار مردوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ حیران تھی کہ سارے اسٹاف میں اسے سب سے زیادہ پذیرائی دی جا رہی ہے۔ ہر ایک اس کے بارے میں جاننے اور اس کے کسی کام آنے کی خواہش کا اظہار کر رہا ہے۔ خیر، الیکشن میڈم کی پارٹی نے اکثریت سے جیت لیا۔ اب مریم کو اپنے خوابوں کی تعبیر ملتی نظر آ رہی تھی۔ مریم کا باپ بھی احتیاطاً ساتھ گیا تھا۔ وزیر صاحب نے شان بے نیازی سے سب کچھ سن کر اپنے نوابزادے کو مریم کا ایڈریس اور نوکری کی درخواست لینے کا حکم دیا تھا۔ مریم رات بھر ایک خوشگوار تاثر لیے رہی لیکن اس کا باپ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بڑے لوگ اپنی خدمت کرانے کے بعد ہی کوئی نوکری یا معاوضہ دیتے ہیں۔ بہر حال مریم کے سامنے یہ تاثر دینا بہتر نہیں تھا۔ چند دنوں بعد میڈم نے سرکاری نوکریوں پر پابندی کی خبر سنا کر مریم کے خوشگوار خوابوں کو کچل دیا۔ لیکن ساتھ میں ایک آس بندھائی تھی کہ گورنمنٹ بے روزگار افراد کو قرضے دے رہی ہے۔ تم اپنے بابا سے مشورہ کر لو۔ اگر وہ راضی ہوتے ہیں تو میں پارٹی کے ذریعے تمہیں قرضہ

دے دوں گی۔ مریم اور اس کے باپ نے کافی دن سوچنے کے بعد دستکاری کا ایک ادارہ کھولنے اور اس میں بچوں کو مفت تعلیم دینے کا سینٹر کھولنے کا پروگرام بنایا اس سلسلے میں کم از کم دو لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ مریم کے باپ نے سوچا جب تک بیٹی کو نوکری نہیں ملتی، وہ اس ادارے سے اپنے اور علاقے کے لوگوں کی خدمت کریں گے اور پارٹی ان کے قرضے بھی معاف کرا دے گی!

مریم کے ادارے کا افتتاح علاقے کے با اثر افراد کی موجودگی میں علاقے کے ممبر نے کیا۔ اس موقع پر بڑی بڑی تقریریں اور دعوے کیے گئے۔ ادارے میں کام کرنے والی خواتین اور بچیوں کو اب سلائی مشینیں اور کپڑے تحفے میں ملنے لگے۔ اب میڈم کے سکول کے علاوہ مریم کے ادارے سے بھی پارٹی کے لیے خواتین کی میٹنگوں اور جلسوں میں ٹولیاں جانے لگیں۔ مریم اب اپنے حسن اور ذہانت کی بدولت بہت مقبول ہو گئی تھی۔ ادارے کے لیے پلاٹ لیتے ہوئے متعلقہ محکمے کے وزیر اور اس کے دوستوں کے سامنے مریم پہلی بار گئی۔ لیکن وہ ایسا نہیں چاہتی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ کر رہی تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی، جو اسے ناپسند تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سی ایسی قوت ہے جو اس سے یہ سب کچھ کرا رہی ہے۔ اسے سوشل سٹیٹس لینے اور سہولیات دینے کے بدلے میں بار بار ہارنے پر مجبور کر رہی ہے۔ مریم اب اس جگہ پہنچ چکی ہے جہاں اس کے اشارے پر سینکڑوں خواتین کہیں سے کہیں آ جا سکتی ہیں۔ مریم کا باپ اس تمام صورتحال سے بے خبر بیٹی کے لیے کوئی اچھا اور مناسب رشتہ دیکھنے میں محو تھا۔ لیکن مریم عورتوں کی فلاح و بہبود اور شعور کے لیے دن رات خدمات انجام دینے میں مگن تھی۔ اس کے بدلے میں اسے خاصی تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ ایک رات جب وزیراعلیٰ کا سیکرٹری اسے لینے آیا۔ مریم کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اگلے دن تیار ہو کر وہ وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ چلی گئی۔ وہاں اس سے ڈاکومنٹس لیے گئے اور چند دنوں میں اعلیٰ عہدے پر تعینات کرانے کا وعدہ کیا گیا۔ اب کی بار مریم ایک مرتبہ پھر خوش گوار خوابوں کی دنیا بسا کر بیٹھ گئی۔ چند دنوں تک پارٹی ارکان سے ملتی رہی تا کہ وزیراعلیٰ صاحب کو یاد دہانی ہوتی رہے اور اسے اعلیٰ عہدے پر

فائز کیا جائے۔ اس دوران اسے کئی بار بلایا گیا۔ امیدوں اور توقعات کی سولی پر چڑھایا گیا۔ مریم اپنے اندر مرتے جیتے یہ قیمت ادا کرتی رہی مگر اپنے اندر کی اس معصوم اور سادہ لڑکی کو نہیں مار سکی جو اپنی عصمت اور اپنی ذات کی سچائی پر یقین رکھتی تھی۔ ایک شام جب پارٹی کے ایک چیف آرگنائزر نے اسے بہت سی آفر دیتے ہوئے اس کا بوسہ لینے کی خواہش کی تو مریم نے کئی خواتین کے سامنے تھپڑ رسید کر دیا۔

مریم کا پہلا خط مجھے ان دنوں موصول ہوا تھا جب حکمراں پارٹی کے ایک ایم این اے کی گاڑی میں مریم کو اٹھایا گیا۔ اور تین دن بعد مریم کو دھمکیاں دے کر اس کے ادارے کے سامنے چھوڑ دیا گیا۔ مریم کے باپ نے مزید بے عزتی سے بچنے کے لیے رپورٹ کرانے سے معذوری کا اظہار کیا لیکن مریم نے مجھے بیان بھجوانے کے علاوہ چیف آرگنائزر کے خلاف ایف آئی آر کروائی تھی جس پر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اب مریم کو ایک تھپڑ کے جواب میں حالات کے کئی تھپیڑے سہنا پڑ رہے تھے۔ سب سے پہلے اس کے سماجی ادارے کو کرپشن کا ادارہ ثابت کرانے کے لیے مختلف لوگوں سے بیانات لیے گئے۔ اسے خواتین کو پارٹی کے بڑے بڑے عہدیداروں، وزیروں، مشیروں اور بیوروکریسی تک پہنچانے کے الزامات سے نوازا گیا۔ مریم اب دوسرے خط میں چند ایسے لوگوں کے بارے میں انکشاف کر چکی تھی جن کے خلاف حقائق کے ساتھ خبر شائع کرائی جاتی تو مجھے بڑی شہرت حاصل ہوتی مگر حکومت وقت کی مخالفت کرنے سے ہمارے اشتہار بند ہونے کا خدشہ تھا اس لیے میرے ایڈیٹر نے میری خبر کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا جس کے بعد مریم نے پہلی ناکام خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کے ساتھ ہونے والے مظالم کی شنوائی نہیں ہو رہی، اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا۔ کوئی اخبار اس کے بیان کی بنیاد پر ان جھوٹے مکار، کھوکھلے اور دغاباز سیاسی لیڈروں اور ان کی پارٹی کے حقائق کے سامنے نہیں لا رہا۔ وہ اب تخلیقی سوچ رکھنے والے ترقی پسند ذہن کے افراد کی تلاش میں ہے جو اس کے مطابق آخری آس تھے۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر ایڈیٹر صاحب کو مریم کے خطوط دکھانے اور اس پر مبنی

رپورٹ بنانے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر ایڈیٹر نے تمام خطوط میرے منھ پر مارتے ہوئے مجھے سچائی کا ٹھیکیدار بننے سے منع کر دیا اور خاموشی سے اخبار کی پالیسی کو فالو کرنے کا حکم دے کر کمرے سے نکال دیا۔ چند دنوں میں مجھے پرمننٹ کیا گیا۔ اب میں خاص بھوبیت کے ساتھ اپنی صحافتی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ ان دنوں ایک خبر کے ذریعے یہ بھی پتہ چلا کہ مریم کے باپ کو بینک کا قرضہ ادا نہ کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے جس کے بعد مریم نے مجھے آخری خط لکھا۔ میں نے مریم کے تمام خطوط کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

آج آٹھ مارچ ہے، خواتین کا عالمی دن۔ میرے مضامین اور اخبار کے ایڈیشن کو بہت پسند کیا گیا ہے۔ مختلف اداروں اور این جی اوز نے ہمارے اخبار کے سینکڑوں ایڈیشن خریدے ہیں۔ میں اب اپنی اگلی پلاننگ اور خواتین کے موضوع پر ایک عالمی سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ لے کر مسرور ہوں۔ اسی دن کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر بھی شائع ہوئی "خواتین کی بہبود اور ترقی کے لیے کام کرنے والی ایک مریم نامی خاتون نے خودکشی کر لی۔ پولیس اصل حقائق تک پہنچنے کے لیے تفتیش کر رہی ہے۔"

افضل مراد

آخری فیصلہ

''شادو شاید تم اس تے سے'' زیبو نے شادو کو بھرے دل سے بد دعا دی۔ شادو اندرونی کمرے میں نیم تاریکی میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی ماں نے رو رو کر اسے بے انتہا بددعائیں دیں بعد سے کمرے کو کنڈی لگا کر کوئلے کے اسٹوو کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور آنسو بھری آنکھیں پلو سے خشک کرنے لگی۔ شادو کا باپ امیت حیرت کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ رات کے واقعات کے منظر اس کی آنکھوں کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ زیبو نے روشن دان سے باہر دیکھا رات اب آخری سانسیں لے رہی تھی۔ صبح ہونے کے تصور سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ زیبو سوچنے لگی: اللہ جانے صبح ہونے کے بعد کیا ہوگا؟ وہ اور امیت لوگوں کی آنکھوں اور زبانوں پر آنے والے کن کن سوالوں کا جواب دیں گے۔ انہوں نے محسوس کیا جیسے دن کی روشنی سارے گاؤں کو ان کے گھر لے آئی ہے۔ ''تمہارے گھر سے زیبو رات کو چیخنے کی آوازیں کیوں آ رہی تھیں؟ کون کہہ رہا تھا کہ میں تم لوگوں کو جان سے مار دوں گا اگر مجھے ؟ شاید شادو بیٹی کی آواز بھی آ رہی تھی خدانخواستہ کوئی ہماری بیٹی کو امیت لالہ عزت بے عزتی کی بات پر کوئی خاموش نہیں رہتا۔ آپ کی بیٹی ہماری بیٹی کی طرح ہے اور زیبو ہماری بہن ہے۔ کوئی ایسی بات ہے تو

بتاؤ وہاب خان نے شادو سے اپنے بیٹے نواب کی شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی وہ بات تو نہیں؟'' امیت اور شادو ان سب سوالوں کے جواب ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈھونڈ رہے تھے اور آخری آواز نے انہیں تھرتھرا کر چونکا دیا۔ ''کسی بے چارے جوان اور خوبصورت لڑکی کے ماں باپ ہیں۔ جرگے میں بات لے جائیں گے یا پولیس میں رپورٹ درج کرائیں گے۔ دونوں صورتوں میں بدنامی ان کی ہوگی۔'' اذان کی پہلی آواز نے دونوں گاؤں کے لوگوں کے لمبے چوڑے چہروں پر لکھے سوالوں سے چند لمحوں کے لیے نجات دلا دی۔ امیت نے اٹھ کر شادو کے کمرے میں جھانکا۔ شادو شدید سردی کے باوجود چھینٹ کے کپڑوں میں گھٹنوں میں سر ڈالے بیٹھی تھی۔ امیت نے بے بسی سے منہ پھیر لیا۔ اسٹوو میں تھوڑا سا کوئلہ ڈال کر راکھ کو لوہے کی سیخ سے ہلا دیا۔

تھوڑا سا دھواں کمرے میں پھیل گیا۔ دونوں کو اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا۔ امیت نے نسوار کی ڈبیا اٹھا کر کھولی اور نسوار منہ میں بھر کر وہ زیبو کے قریب بیٹھ گیا۔

زندگی میں شاید پہلا موقع تھا کہ امیت اور زیبو نے نماز نہیں پڑھی یا ان کا نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہا۔ شادو امیت کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ بڑی منتوں اور پیروں بزرگوں کے درباروں میں جا جا کر نیاز دینے اور چادریں چڑھانے کے بعد ان کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ دونوں نے شادو کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ امیت گاؤں میں پائی اور کچے مکان بنانے کا کام کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر جب اس کی دیہاڑی نہیں لگتی تو وہ فضلو کی پرچون کی دکان سے ادھار لے آتا اور شادو کو کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہونے دیتا۔ شادو کی پیدائش کے بعد زیبو اور امیت کے گھر جیسے خوشیوں نے مستقل بسیرا کر لیا تھا۔ وہ جب پانچ برس کی ہوئی تو اسے سیپارہ پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔

شادو ذہین تھی۔ اس نے بہت جلد قرآن پاک حفظ کر لیا۔ امیت نے ساری برادری کے اختلافات کے باوجود شادو کو اسکول میں داخل کرا دیا تائی ذو بخت نے زیبو کے گھر آ کر ''زندہ مرگ'' کا اعلان کیا اور واضح الفاظ میں یہ کہہ کر نکل گئی کہ تم لوگ اپنی بیٹی کو پڑھا لکھا کر

بے حیا بنانے جا رہے ہو۔ اس لیے آئندہ تمہارے کسی غم یا خوشی میں شریک نہیں ہوں گے۔
امیت اور زیبو نے پورے خاندان کی مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے شادو کو آٹھ جماعتیں
پڑھائیں لیکن اس سے زیادہ پڑھانا معیوب سمجھا۔ زیبو سے مشورے کے بعد شادو کو گھر بٹھا دیا تو
شادو کی ماں باپ سے شدید لڑائی ہوئی۔ اس کے باوجود شادو کی دلیلیں، جواز اور آنسوؤں کی کوئی
شنوائی نہیں ہوئی۔ باپ نے کہا کہ پورے گاؤں میں کسی کی بیٹی اتنی جماعتیں نہیں پڑھی۔ اب تم
چاہتی ہو کہ خاندان میں میری ناک کٹ جائے، تو ٹھیک ہے تم جا کر پڑھنے۔ شادو کے سارے
خواب ٹوٹ گئے۔ وہ میٹرک کے بعد گاؤں میں استانی بننا چاہتی تھی، وہ گاؤں کی لڑکیوں کو پڑھنا
لکھنا سکھانا چاہتی تھی۔ لیکن اب وہ ماں باپ کی عزت بچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اب
شادو گھر میں جھاڑو، برتن اور صفائی کرتی میں مصروف نظر آتی۔ کبھی کبھار اپنے سکول کی کتابیں
اور کاپیاں نکال کر پڑھتی اور افسردہ ہو جاتی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شادو کے رشتے کی
بات بھی ادھر ادھر سے ہونے لگی۔ زلیخا کی بیٹی کی شادی میں مہندی کی رسم کے موقع پر نواب
نے شادو کو پہلی بار دیکھا۔ شادو کو جب محسوس ہوا کہ نواب اسے چاہتا ہے تو نواب بھی اسے اچھا
لگنے لگا مگر اس دوران دونوں نے ایک دوسرے کو تنہائی میں ایک آدھ بار ہی دیکھا تھا۔ شادو کو
اپنے ماں باپ کی عزت بہت عزیز تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نواب اور اس کی محبت کی خبر کسی کو
ہو۔ اس نے ہمت کر کے چند سطریں لکھ ڈالیں اور انہیں ایک لفافے میں ڈال کر نواب کو بھجوایا۔
یہ خط اس کی سہیلی عاشہ نے پہنچایا۔ شادو نے نواب کو لکھا کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس
کے رشتہ کے لیے اپنے ماں باپ کو گھر بھیجے۔ نواب نے باپ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار
کیا۔ دہاب خان اس بات پر آگ بگولہ ہو گیا اور نواب کو اپنے خدمت گزاروں کی بیٹی کو بیوی
بنانے سے روکنے کی کوشش کی لیکن نواب اپنی محبت حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ امیت اور
زیبو اس ساری صورتحال سے بے خبر بیٹی کی شادی کے لیے پیسہ کچھ جمع کر رہے تھے۔ البتہ
امیت اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کی شادی کا خواہش مند تھا جبکہ زیبو اسے ناپسند کرتی تھی۔
نواب نے ایک رات باپ کو آخر کار راضی کر لیا۔ وہ چند لوگوں کے ہمراہ شادو کا رشتہ لینے امیت

کے گھر آیا۔ وہاب کو دیکھ کر امیت اور زیبو بہت خوش ہوئے۔ شادو کے نواب کے ساتھ رشتے پر راضی ہوگئے۔ امیت نے دعا کے بعد وہاب سے مخاطب ہوکر کہا کہ خواجہ میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ پوری آٹھ جماعتیں پڑھ چکی ہے۔ وہاب کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی سی چھا گئی۔ اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو اٹھنے کے لیے کہا اور مزید بات کئے بغیر باہر نکل گیا۔ امیت اور زیبو حیران رہ گئے۔ شادو جو کھڑکی کا پٹ کھولے یہ ساری گفتگو سن رہی تھی اپنے کمرے کی بروتک کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔ وہاب نے چند روز بعد امیت کو جواب بھجوایا کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ شادو سے نہیں کرے گا۔ نواب نے اپنے باپ کو منانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ راضی نہ ہوا اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ شادو ہر اعتبار سے منفرد ہے، اسے میں بہو بنا لیتا اگر وہ چار جماعتیں نہ پڑھی ہوتی۔ یہ گاؤں کا ماحول ہے۔ کوئی لڑکی ہماری آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کرے یا کبھی بھی اپنے حقوق کی بات کرے، یہ ہمیں منظور نہیں۔ تم گاؤں کی کوئی ناخواندہ لڑکی دیکھ آؤ۔ ہم تمہارا رشتہ آج ہی کر دیں گے۔ نواب نے کہیں اور شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس رات نواب رات شادو کو لے کر گاؤں سے بہت دور جانے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ شادو اپنے ماں باپ کی عزت پر جان قربان کر سکتی تھی لیکن نواب کے ساتھ رات کے اندھیرے میں کہیں بھاگ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نواب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ واپس اپنے گھر چلا جائے لیکن نواب اس کی بات ماننے کے بجائے اسے زبردستی ساتھ لے جانے لگا تو شادو چیخ اٹھی جس پر امیت اور زیبو جاگ گئے۔ وہ نواب کو دیکھتے ہی ششدر رہ گئے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ نواب کو خاموشی سے واپس جانے کو کہتے۔ نواب ان کی منت سماجت کے باوجود جانے کے لیے راضی نہ تھا۔ امیت نے اسے اپنی عزت و بے بسی کا واسطہ دیا لیکن وہ شادو کے بغیر جانے کو تیار نہ تھا وہ اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی مشکل مرحلے سے گزرنے کو تیار نظر آ رہا تھا۔ شادو نے نواب کا پاگل پن محسوس کرتے ہوئے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ شادو کے انکار پر تڑپ اٹھا اور دھمکی آمیز لہجہ میں شادو کو کل رات تیار ہو کر اس کے ساتھ خاموشی سے چلنے کا حکم دے کر دیوار پھلانگ کر نکل گیا۔

دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ روزمرہ کی مصروفیت میں مگن یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آ جا رہے تھے۔ شاید امیت کے گھر میں ہونے والے رات کے واقعہ کی کسی کو خبر نہیں تھی۔

میت کے گھر کا دروازہ ابھی تک نہیں کھلا تھا۔ تائی زر بخت سبزی والی ریڑھی سے سبزی لینے کے لیے نکلی تو زیبو کو آواز دے کر بولی:

''زیبو آج کیا دن بھر سونے کا ارادہ ہے کم بخت، دن چڑھ گیا ہے'' زر بخت کوئی جواب نہ پا کر تشویش میں مبتلا ہوئی۔ وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی کہ شادو کے کمرے کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ اسٹور کے ساتھ امیت اور زیبو سکتے کے عالم میں بیٹھے ہیں۔ تیزی سے شادو کے کمرے میں داخل ہوئی۔ شادو اپنے چھینٹ کے دوپٹے کو گلے میں ڈالے، چھت کے شہتیر کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ شاید زر بخت کی چیخ نے پورے گاؤں کو شادو کی خودکشی کی خبر دے دی تھی۔

افضل مراد

دوسرا سچ

یہ سچ ہے کہ میں نے ذہنی طور پر کبھی بھی انہیں تسلیم نہیں کیا۔

میری ذہنی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں یہ ادبی طبقہ استحصالی قرار پایا گیا ہے۔ گزشتہ برسوں میں ترقی پسندوں کی ایک گولڈن جوبلی کانفرنس میں شمولیت کے بعد تو میں خاصا ترقی پسند اور روشن خیال ہو گیا تھا۔ اب میں زندگی میں جدلیاتی پہلوؤں کو فن کا حصہ جانتے ہوئے زیادہ سے زیادہ معاشرتی برائیوں، ظلم، ناانصافی اور روایت پسندی کے بندھے ٹکے رویوں پر لکھنے لگا تھا۔ کبھی کبھار کسی مضمون یا ادبی تنقیدی نشستوں میں مجھے ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے لکھا یا پکارا جاتا تو مجھے خوشی سی ہوتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ اب مجھے اپنی ترقی پسند پر زیادہ خوشی نہیں ہوتی بلکہ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی ترقی پسندی پر تھوڑا تھوڑا شرمندہ ہوں۔ میں نے فیوڈل سسٹم پر بہت زیادہ اور بہت سخت لکھا تھا۔ انہیں ہر لحاظ سے رد کرتا رہا تھا۔ میں ان کو علاقے کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا رہا ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں نے اس سسٹم کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بارے میں حقائق سے ناواقف تھا زیادہ تر ان رسمی باتوں کو دہراتا رہا تھا جو ترقی پسندی کی

علامت سمجھی جاتی تھیں۔

سردار نیک بخت خان کے بیٹے میر رحیم جان سے ملاقات اور گہری دوستی کے بعد میری سوچ پوری طرح سے تبدیل ہوگئی ہے۔ یقین ہی نہیں آرہا دوستو، سردار، خان اور نوابوں میں اتنا شعور، تی انسانیت اور خاص طور پر فنون لطیفہ سے لگاؤ بھی ہوسکتا ہے۔ میر رحیم جان سے میری پہلی ملاقات شدید سردرات میں اخبار کے دفتر سے چھٹی کے بعد آتے ہوئے ہوئی۔ انہوں نے پجارو روک کر مجھے لفٹ کی آفر کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ حالانکہ سردی کی شدت سے گھبرائے بدن کا یہ تقاضا تھا کہ کوئی سائیکل سوار بھی لفٹ دے تو انکار نہ کیا جائے۔ میر رحیم جان نے تکلف برطرف کے انداز میں گاڑی سے اترتے ہوئے اصرار کیا کہ میں انکار نہ کروں۔ اس کی نئے ماڈل کی پجارو میں بیٹھتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ پجارو کے اندر کسی قسم کے پرفیوم اور سگار کے دھوئیں کی ملی جلی خوشبو نے ایک عجیب طرح سے معطر فضا تخلیق کر رکھی تھی۔ میر رحیم جان نے مختصر بلوچی احوال کیا لیکن میرے فن کے بارے میں کافی باتیں کیں انہوں نے میری تحریروں کو خاصا سراہا۔ خاص طور پر میرے ٹی وی ڈراموں کی خاصی تعریف کی۔ انہیں میرے ڈراموں کے کردار تک یاد تھے۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں خود کو اندر ہی اندر بے حد مسرور اور پرسکون محسوس کرنے لگا۔ گلی کے نکڑ پر اتارتے ہوئے انہوں نے مجھ سے آئندہ ملاقات کا وعدہ لیا۔ اور ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ چلتے چلتے اپنا ذاتی فون نمبر بھی عنایت کردیا۔

ان دنوں میں ایک ٹی وی ڈرامہ سیریل کا اسکرپٹ لکھنے میں مصروف تھا۔ رات دن کرداروں کے گرد رہتا۔ صرف شام کو ایک آدھ گھنٹہ اخبار کے دفتر جاکر اپنا ڈیلی کالم لکھ آتا۔ واپسی پر اپنے لیے چائے اور سگریٹ کا کوٹا بھی خرید لاتا۔ ایک دن شام گئے کیبش کے سامنے والی دکان سے ملک پیک خریدتے ہوئے میر رحیم جان کی گاڑی میرے قریب آکر رکی۔ انہوں نے اتنے روز ملاقات اور ٹیلی فون پر رابطہ نہ کرنے پر شکوہ کیا۔ میں نے بتایا کہ ڈرامے کے اسکرپٹ کی وجہ سے مصروف رہا ہوں اس لیے آپ سے ملاقات نہ ہوسکی اور نہ ٹیلی فون کا موقع

میسر آ سکا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں اور میر صاحب کینٹ کی طرف نکل گئے۔ میں نے راستے میں انہیں اپنے تخمیم کے بارے میں بتایا۔ اس پر انہوں نے بڑی واہ واہ کی۔ میں حیران رہ گیا۔ میر رحیم جان نے نہ صرف میری ساری علامتوں کو پوری طرح سمجھا اور مجھے داد دی۔ بلکہ رات کو میری ذہنی تھکان کو مٹانے کے لیے اعلیٰ قسم کی وسکی کا بندوبست بھی کر دیا۔

میں میر رحیم جان کی کوٹھی میں پہلی بار آیا تھا۔ سب سے پہلے بلڈنگ کی بالائی منزل پر لگے ڈش انٹینا نے میرا استقبال کیا۔ کوٹھی میں داخل ہو کر ہم سیدھے رحیم جان کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ اتنے بڑے اور وسیع ڈرائنگ روم میں اپنے چھوٹے سے ۱۰×۱۰ کے کمرے کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑی تنگی کا احساس ہو رہا تھا۔ چاروں طرف نرم صوفے سجے تھے۔ میں نے ان پر بیٹھتے ہوئے خود کو دھنستا ہوا محسوس کیا۔ میر رحیم جان کے نوکر بڑی تیز رفتاری سے وسکی کے ارد گرد گلاس اور برف سجا گئے۔ میں نے میر صاحب سے درخواست کی کہ نیچے بیٹھتے ہیں۔ میری عجیب سی عادت ہے کہ ایک پیگ کے بعد کسی نہ کسی چیز سے ٹیک لگاتا ہوں۔ میر رحیم جان نے میری مزید کامیابیوں کے نام جام کا آغاز کیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خصوصاً میرے ساتھ گفتگو کرنے پر بے حد خوش ہیں۔ دھیرے دھیرے محفل سرور کی منزلیں طے کرنے لگی۔ میر رحیم جان نے ڈیک پر سرور کے کیسٹ کو بہت دھیما چلا دیا تھا جو ماحول کو زیادہ مسحور کن بنا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میر صاحب نے مجھ سے شاعری سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے چند ابتدائی دور کی رومانی نظمیں سنا ڈالیں۔ موڈ میں آ کر وہ مسلسل فرمائشیں کرنے لگے۔ ''تم شاعر لوگ بڑے حسن پرست ہوتے ہو۔ ویسے بھی ہر رات خوبصورت خیالات اور خوبصورت لوگوں کے درمیان رہتے ہو۔ فن کی دنیا میں یہی ایک خوبی ہے۔'' قدرے توقف کے بعد گمبھیر آواز میں بولے: ''میرے اندر بھی ایک فنکار ہے لیکن میں اسے باہر نہیں لا سکا۔ بابا جان کہتے ہیں، یہ ریڈیو ٹی وی پر گانا ہمارے لیے خیر اس تذکرے کا کیا کرنا یوں سمجھو کہ اب تمہارے جیسے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تسکین کر لیتا ہوں۔'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے سیاست میں فیوڈل کے رول پر ان کی رائے لینا چاہی لیکن میر رحیم جان نے تقاضا کیا کہ ''سیاست پر گفتگو

نہیں ہوں۔ ویسے بھی رات دن بابا جان اور بڑے بھائی کی سیاسی میٹنگز سے تنگ آ چکا ہوں۔"

شاعری پر کافی باتوں کے بعد نشست برخاست ہوئی اور میر رحیم جان کے ڈرائیور نے مجھے گھر پہنچا دیا۔

میر صاحب سے ملاقاتیں اب باقاعدہ ہو چکی تھیں۔ ان دنوں میرے ڈرامے کا سکرپٹ جی ایم کانفرنس سے منظور ہو کر آ گیا اور واجد جو میرے ڈرامے کے پروڈیوسر تھے۔ ڈرامے کی کاسٹنگ پر غور و خوض کرنے لگے۔ ہاں یہ بھی بات بتاتا چلوں کہ اس دوران میں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اسٹیج ڈرامہ بھی پیش کیا جو بریخت کے مشہور ڈرامے کا ترجمہ تھا۔ میری خواہش پر رحیم جان ڈرامے کے چیف گیسٹ بنے اور انہوں نے ڈرامے کو بہت سراہا۔ بیس ہزار روپے کے عطیے کا اعلان بھی کیا۔ ڈرامے کے اختتام پر پوری کاسٹ ان کی فرمائش پر شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے گئی۔ ڈرامے کی ہیروئن شہلا میر صاحب کے سامنے بچھی جا رہی تھی میں نے میر صاحب کو الگ لے جا کر سمجھایا کہ "اسے لفٹ نہ کرائیں۔ پیسے اور گاڑی دیکھ کر ایسی لڑکیاں پاگل ہو جاتی ہیں۔ چار دن بستر جینے کے لیے دوسرے کی ساری سماجی زندگی اندھیر کر جاتی ہیں۔" میر رحیم جان میری بات پر مسکراتے ہوئے بولے، "میں تو اخلاقاً خوش کر رہا تھا ویسے بھی کوئی اتنی خوبصورت تو نہیں ہے۔" اس بات پر ہم دونوں کافی دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ رات بہت سرد تھی۔ میر صاحب نے میرا اگلا پروگرام دریافت کیا۔ میں نے بلا تکلف گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور ان سے لفٹ لی۔ چلتے ہوئے میر صاحب نے گاڑی کی اگلی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور برانڈی کی بوتل میری طرف بڑھا دی۔ میری تھکی ہوئی آنکھیں اور شل ہوتے ہوئے اعضا جیسے حرکت میں آ گئے لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے پینے سے انکار کر دیا۔ گلی کے نکڑ پر اترتے ہوئے میر صاحب نے زبردستی برانڈی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے متشکر نظروں سے انہیں خدا حافظ کہا اور گھر کی جانب روانہ ہوا۔

صبح دم واجد صاحب کا پیغام ملا کہ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ ہونی ہے، آپ تین بجے پہنچ

جائیں۔ مقررہ وقت پر میں ٹی وی اسٹیشن پہنچ گیا۔ پوری کاسٹ پہلے سے موجود تھی۔ میں نے کریکٹر کے بنیادی خیال اور کرداروں کے حوالے سے بریفنگ کا آغاز کیا۔ واجد نے اس مرتبہ ڈرامے میں دو نئی اور باصلاحیت لڑکیوں کو متعارف کرایا تھا۔ میں نے واجد کو اس حوصلہ افزا اقدام پر داد دی۔ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ میری توقع کے مطابق ہوئی۔ پہلی مرتبہ میرے کرداروں کے ساتھ واجد نے انصاف کیا تھا اور بہت پرفیکٹ کاسٹنگ کی تھی۔ اس دوران میر رحیم جان نے دو بار ٹیلی فون کیا۔ میں نے اسے کہا میری ریہرسل ہے لیکن وہ ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ چھ بجے تک فارغ ہوں گا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ٹی وی اسٹیشن آجائیں گے۔

ریڈنگ کے بعد ہم ڈرامے کے فنکاروں کے ساتھ کینٹین جا کر بیٹھ گئے۔ ٹھیک وقت پر میر رحیم جان گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں نے انہیں فون کر کے کینٹین بلوایا۔ اپنے اسلحہ بردار محافظوں کے ساتھ میر صاحب کینٹین آگئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی وہ آج شام سے پہلے ہی خاصے موڈ میں تھے۔ میں نے ان کا سرسری سا تعارف کرایا اور انہیں لے کر الگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میر صاحب کا موڈ آج خاصا بگڑا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے ان کا جی بہلانے کی کوشش کی لیکن میر صاحب میری گفتگو پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ان کی نظریں سامنے ٹیبل پر جمی تھیں۔ واجد کاسٹ کے ساتھ باہر جانے لگا تو میر صاحب نے بل کی ادائیگی کی خواہش کا اظہار کیا۔ واجد نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے کہا، ”رہنے دو واجد کوئی بات نہیں، میر صاحب غیر تو نہیں ہیں نا۔“

تھوڑی دیر بعد ہم بھی کینٹین سے باہر نکلے۔ چند فنکار گاڑی کے انتظار میں تھے۔ میر صاحب نے فرمائش کی کہ انہیں لفٹ دیں۔ میں نے کہا ”نہیں میر صاحب ٹی وی کی گاڑی ہے ان کے لیے۔“ انہوں نے گاڑی کی چابیاں کارندے کی طرف پھینکتے ہوئے ٹی وی اسٹیشن کی بلڈنگ پر نظر ڈالی اور کہا، ”حمید یار، تمہارا کیا فائدہ “ میں نے حیران ہوئے بغیر مسکراتے ہوئے میر صاحب کی جانب دیکھا ”دیکھو نا! تم ڈرامہ رائٹر ہو۔ تمہاری مرضی اور پسند سے

بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی آج تو تمہارے ڈرامے کی کاسٹ میں بہت خوبصورت اور نئی لڑکیاں بھی تھیں۔ ان سے ہماری دعوت کراؤ۔ انکار کریں تو ڈرامے کا اسکرپٹ واپس لے لو آخر کو تم ڈرامے کے تخلیق کار ہو۔"

شدید سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے مزدوروں کے کتنے ہی ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ ہاتھ جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ ہاتھ جو فیکٹریوں میں رہن رکھ دیئے گئے ہیں۔ وہ ہاتھ جو آرائش تخلیق کرتے ہیں مگر وہ دوسروں کے لیے۔ میرے ہاتھ سے اسکرپٹ ایسے گرا جیسے ہتھیلی پر بچھو نے ڈنک مار دیا ہو!

کانپنے لگتا ہے، کسی نے ذرّے کا جگر چیرا اور پہاڑ سفید ہوگیا۔ کہانی پھر بکھر گئی۔۔۔ یا تو ٹوٹی کہانی کے ٹکڑے جڑیں یا ہم کہانی سے جڑ جائیں۔ کہانی چل رہی ہے، دھیرے دھیرے راستہ طے کر رہی ہے، زمین کو اپنے گھیرے میں لینے کو ہے کہ اسے کہیں تو پناہ ملے۔ آدمی نے بہت دُکھ دیے ہیں۔ آدمی نے بہت دکھ اٹھائے ہیں دھرتی دُکھ اور آدمی کہانی پھر کیا ہوگا؟ کہانی سنوں تو اگلا مرحلہ مجھے معلوم ہو، ورنہ وہیں تک معلوم ہے جہاں تک سُنی ہے۔ زمین گیت تھی اور آسمان روح، پرانے لوگ اور پکی باتیں یہی کہتے آئے ہیں۔ زمین کی تہہ میں گیت دبے ہوئے ہیں اور زمین کے اوپر راستے بنے ہوئے ہیں، جس پر خانہ بدوش بھٹکتے پھرتے ہیں اور بنجارے گیت جمع کرتے رہتے ہیں۔ آوارہ منش ادیب بروس چیٹ ون (Bruce Chatwin) کو ان راستوں کا یقین تھا، اسی لیے اس نے اپنے سفر اور تلاش کو 'گیتوں کی لکیروں' کا نام دیا تھا Songlines۔ بروس چیٹ ون جواں مرگ گزر گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چین کے کسی پرانے عجائب گھر میں رکھی ہوئی تین ہزار برس پرانی ہڈی سے اسے کوئی ایک Fungal infection لگ گئی جو ہزاروں لاکھوں میں ایک آدمی کو لگ سکتی ہے۔ اگر جیتا رہتا تو میں اس سے پوچھتا کہ اے میم تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟ اس کی موت ایک روایت ہے اور میری خواہش افسانہ، مجھے بھی اب یقین ہو چلا ہے کہ خط نغمہ کی طرح زمین پر خط افسانہ کھنچی ہوئی ہے 'Story line' اوپر نیچے، آڑی ترچھی یہ لکیر اس کرّے کو جگہ جگہ سے کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہے ایک لکیر جس کا فرضی ہونا بھی غیر حقیقی نہیں۔ آپ طے کرتے رہیے کہ تصوّر، حقیقت ہوتا ہے یا افسانہ، میرے سامنے اس وقت یہ سوال ہے کہ کیا بلوچستان بھی اسی کسی افسانوں کی لکیر پر واقع ہے؟

لیکن بلوچستان تو خود افسانہ ہے۔ مقامات، افراد، واقعات ان چند لوگوں نے طے کر دیے جنہوں نے اپنے آپ کو داستان گو کے روپ میں پایا اور ان اجزاء سے قصہ تیار ہوگیا agreed up on fiction جسے ہم آج سن رہے ہیں جب کہ ہم سے نہ سنا جاتا ہے نہ

سمجھا جا رہا ہے۔

بلوچستان کے قصّے سے میری مراد ہے عہد حاضر کا بلوچستان اس دور کا جب ہم اخبار، ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ کے عطا کردہ بیانیے کے عادی ہو گئے ہیں اور کہانیوں پر سے ہمارا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ مصنوعی سیاروں سے جھپتی ہے اور انٹرنیٹ سے فروغ پاتی ہے خبر یہ ذرائع اتنے مضبوط ہیں کہ ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ خبر وہیں تک ہے جہاں تک ان ذرائع سے پہنچتی ہے۔ جو بات ان ذرائع سے نشر نہ ہو وہ خبر بھی کیا؟ ایسی خبر نہ بنیں تو زمینی حقائق بھی ہم تک نہیں پہنچتے۔ اور اگر بھولے بھٹکے، ناگہانی یا حادثاتی طور پر پہنچ بھی جائیں تو بے زاری، بے حسی، نا واقفیت کی اس آہنی زرہ بکتر کے پار نہیں ہو سکتے، جو ہم نے اپنے اوپر خود ہی مسلط کر لیا ہے اور اسے رکاوٹ جاننے کے بجائے اپنی کشادہ نظری یا عدم واقفیت کا ثبوت سمجھ کر اتراتے ہیں۔ اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ کسی شاعر نے اداسی کو دل کا دوسرا نام کہا تھا۔ نوبت اب یہ آ گئی ہے کہ صحافت کا دوسرا نام ہمارے لیے بے خبری ہے اور افسانے کا دوسرا نام، ان کہی۔۔۔ جو کسی سے کہی نہ گئی وہی زمانہ بڑے شوق سے سن رہا ہے۔ نادیدہ اور ناشنیدہ، بلوچستان ایسا ہی ایک افسانہ بن گیا ہے۔ اب اس کی کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چنتے جائیے۔ اداس دل میں بھرتے جائیے کہ شاید اس طرح یہ کہانی پوری سامنے آئے اور ہمیں معلوم ہو سکے کہ جو یوں ہوا تو کیوں ہوا اور پھر کیا ہوا؟

مگر یہ پھر کیا ہوا، کا سوال بلوچستان کے تناظر میں پوچھنے میں حق بجانب بھی اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ اب کیا ہو رہا ہے، کا سوال بھی جواب کی ضرورت سے عاری ہے۔ جب سب کچھ اسی طرح ہو رہا ہو تو نہ سوال اٹھتا ہے نہ خبر بنتی ہے۔ ہم بھی اطمینان سے رہتے ہیں ایسی جگہیں جغرافیے ہی نہیں، شعور کے حاشیے پر آسانی سے دھکیل دی جاتی ہیں۔ یاد آتا ہے، ہم چونکتے ہیں تو اس وقت جب کوئی خبر بننے لگتی ہے۔ پھر جہاں تک خبر بن جاتی ہے، ہماری توجہ وہاں تک قائم رہتی ہے۔ اور جو روداد اس خبر میں سمائے

نہیں رکھتی، وہ تو درست ہے ایک ایسی انوکھی اور ان کہی کہانی بن کر رہ جاتی ہے، وہ واقعہ جو
کبھی پیش آنے کا تو ممکن نہ تھا۔ باقی ادب وطن کے لیے ہے بلوچستان ایسی ہی ایک کہانی ہے جہاں
تاریخ مرتب ہو کر وطن میں ہی الجھی رہ جاتی ہیں۔ کبھی تو خبروں کے بجائے ان سے بات کر کے دیکھیں
کہ وہاں زندگی کیسی ہے اور اس زندگی کی کہانی کیا ہے۔ دھند اور دھوئیں سے باہر نکلنا چاہتی ہے یہ
کہانی۔

کہانی کی اصل جڑیں حقیقت نہیں، سب تو تبھی ہے۔ جہاں کہانی پر کان نہ دھرا جائے
وہاں حقیقت کیسے عیاں ہو؟ شواہد اور دستاویزات پر مبنی تاریخ جہاں روایت میں گم ہونے لگتی
ہے، اس سے بھی پہلے سے چلتی ہوئی آتی ہے بلوچستان کی کہانی کی لہر۔ آج کا تضاد اور
جدیدیت اور افسانہ ہے تو قدیم تاریخ شاعری کی لوک روایت۔ کئی برس کی تلاش و جستجو کے بعد
لانگ ورتھ ڈیمز Langworth Dames نے اپنی تالیف Popular poetry of the
Baloches (۱۹۰۷ء) میں ایسی شاعری کے نمونے جمع کیے جو اس نے زبانی روایت سے سُن
کر کاغذ پر اُتار دیے تھے۔ اور جن نمونوں میں رزمیہ اور رومانی عناصر پائے ان کے لیے
"بیلڈ" کا لفظ استعمال کیا اور 'Poema el cid' سے مشابہ قرار دیا تھا۔ یہ قدیم یورپی کلاسیک
بھی عربی اثرات کا حامل ہے، یہاں تک کہ اس کے مرکزی کردار کا نام بھی 'السید' کی بدلی اور
بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ بلوچی روایت میں transformation کا عمل بھی
عربی کے زیرِ اثر ہی آتا ہے۔ ورنہ اس زبان کا قدیم روپ اور اس کے ڈانڈے، محمد سردار خان
بلوچ کی تصنیف Literary History of the Baluchis (دوسری، ۱۹۷۷ء) کے مطابق
سامیوں کے نسلی سلسلے سے جا ملتے ہیں جس میں بابلی، آشوری، کلدانی، کنعانی، فونیقی،
عبرانی، حبشی اور عرب بھی منسلک ہیں۔ تاہم یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ "بلوچستان کی ثقافت پر سے
تاریکی کا پردہ اٹھانے" کی اس کوشش میں سردار خان بلوچ نے کرنل ڈیمز کی کتاب کا حوالہ دیا
ہے کہ "یہ پرانی بلوچی نظموں کا مجموعہ ہے" مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "ان میں سے
اکثر نظمیں نامکمل، بے قاعدہ اور نادرست ہیں" اور ایسی کتاب "قابلِ اعتبار تحقیق کے لیے خام

مواد فراہم کر سکتی ہے"۔ قدیم منظومات کی یہ زبانی روایت آج کے دور تک آتے آتے ٹوٹ جاتی ہے جب ہمارا سامنا افسانے سے ہوتا ہے۔ پھر یہ افسانہ بھی ادھورا ہی رہ گیا۔ اور یہ داستان جب مختصر افسانے میں ڈھلنے لگتی ہے تو پرانی روایت کی سرزمین بھی جوں کی توں نہیں رہتی۔ اس کا محیط کم ہو جاتا ہے۔ دونوں میں سے اصل افسانہ کون سا ہے۔ اس میں بھی امتیاز کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ افسانہ در افسانہ ہے۔ "بلوچ قوم کی صحیح تاریخ" پیش کرنے کے لیے تاریخی اسناد و شواہد اور داخلی مواد" کے سرے سے بلوچستان میں وجود نہ ہونے" کا شکوہ کرتے ہوئے میر گل خاں نصیر نے، جن کو آسانی کے ساتھ بیسویں صدی میں بلوچستان کے قومی شاعر کا درجہ دیا جا سکتا ہے، اپنی مبسوط تالیف "تاریخ بلوچستان" کے سرآغاز میں لکھا ہے:

> "سرزمین بلوچستان۔۔۔ کُلّیہ یہ سرزمین نہیں جسے آج کل نقشوں میں بلوچستان کے نام سے دکھلایا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت بلوچستان کا وہ حصہ ہے جسے بلوچ قوم کی گزشتہ پنج صد سالہ تاریخ میں مرکزیت کا شرف حاصل رہا ہے یہ پورا بلوچستان نہیں، اسے تو برطانوی حکومت نے اپنے سامراجی مقاصد کے حصول کے لیے سرزمینِ بلوچستان کے حصے بخرے کرنے کے بعد بلوچستان کے نام (سے منسوب کیا) ....."

(میر گل خاں نصیر، تاریخ بلوچستان، ۱۹۵۲ء)

یہ گھڑا گھڑایا افسانہ آج بھی بلوچستان کے نام سے چلا آ رہا ہے۔ آج کے افسانوں کا رواں پیش منظر میروں کا دور یا برطانوی دور حکومت نہیں بلکہ پاکستان ہے۔ افسانہ نگاری ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کے قائم کردہ مصنوعی ڈھانچے کو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ نئے ملک کی تشکیل میں صوبوں کی حد بندی میں ثقافت، زبان، لسانی روایت اور نسل کے زمینی حقائق کو بنیاد بنانے کے بجائے کسی قسم کی تبدیلی یا تنظیم نو روا نہیں رکھی گئی۔ سامراجی دورِ سلطنت کا ڈھانچہ، وفاقی ڈھانچے میں بدل گیا اور

Colonial Balochistan- (مرتب کردہ Paul Titus، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۹۶ء) میں اس مسئل پہ تغیر سماج کے قابل توجہ منظر کے کئی پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے خاصی گہرائی کے ساتھ جانچا اور پرکھا گیا ہے، لیکن اس قسم کے مطالعے کے لیے ایک مجموعی فریم ورک بجائے خود ایک سوالیہ نشان ہے۔ اسی مجموعے کے مقدمے کا آغاز ہی مرتب کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ جو لوگ خود کو بلوچ قرار دیتے ہیں، یا جو لوگ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو جن بہت سی ستم ظریفیوں کا سامنا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ جنوب مغربی ایشیا کی سب سے بڑے اور سب سے اسٹریٹجک نسلی خطوں کے باسی ہیں۔ یہ ایسا نسلی گروہ ہے جس کے بارے میں بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس پر لامحالہ یہ سوال در سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسٹریٹجک اہمیت کا تعین کس نے اور کس بنیاد پر کیا۔ یہ یقیناً ایک بیرونی و خارجی نقطۂ نظر ہے، جب کہ داخلی نقطۂ بلوچوں کی اپنی شناخت اور اس کے عناصر ہی ہوں گے، جس میں قدیم رزمیہ شاعری بھی شامل ہے اور جدید انداز کے افسانے بھی۔

نقطۂ نظر کے اس تفاوت کو emic اور etic کے فرق سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر فاضل مرتب اس ستم ظریفی کی وجوہات تلاش کرتے ہوئے حاشیے کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہر لحاظ سے قابل توجہ ہے:

This is due, no doubt, to the fact that, although the Baluch homeland and penetrates two major culture areas, Iran and India, it is on the periphery of both. Balochistan's distance from centres of power, its harsh, arid climate, and its limited productivity have meant that the Baloch have generally been marginal to major events in the seats of imperial power, and this of little interest to scholars.

ہم اس افسانے کی طرف آتے ہیں تو اس کے بیانیے کا یہ امکان بھی اُبھرتا ہے کہ مذکورہ دو بیانیوں سے مختلف اور منفرد یہ متحدہ بیانیہ ہے اور اس میں جو معنویت پنہاں ہے وہ ان دونوں سے ممتاز ہے۔ یہ تخلیق کا عطا کردہ وصف ہے۔

اس تخلیقی وصف کی شناخت اور تحسین سے پہلے بلوچستان میں ادب کے ایک اور زاویے کی نشان دہی بھی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اس زاویے کا کچھ اندازہ پال ٹائمس کے مرتب کردہ مجموعے کے ایک اور مقالے سے لگایا جا سکتا ہے۔ یوں تو اس مجموعے کے بعض دوسرے مقالوں میں بھی بلوچستان کا ادب موضوع بنا ہے، مثلاً کارینا جہانی (Carina Jahani) نے زبان کے استناد کے حوالے سے شاعری اور قوم پرستی کے باہمی تفاعل کا جائزہ لیتے ہوئے قوم پرست سیاست کے conjunction میں "بلوچی ادبی کاوشوں کے ایک خود آگاہ ارتقا (self-conscious development of Baloch literary efforts) کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ اور اسی تذکرے میں حب الوطنی، نسل پرستی، قومیت اور ادبی روایت کے درمیانی intersection کی نشان دہی کی ہے، بلوچستان میں افسانے کی کونپل اسی انٹرسیکشن سے پھوٹی ہے، اور انہی عناصر کے انٹرایکشن کی وجہ سے اس رنگ اور وضع کے برگ وبار لائی ہے۔ رچرڈ سلم باخ نے اپنے مقالے میں جہاں اس نکتے پر توجہ صرف کی ہے کہ ایک ادبی سرگرمی کس طرح ایک اقلیتی گروہ کو ثقافتی اظہار (articulation) کی حکمت عملی فراہم کرتی ہے، وہاں اس نے اس حوالے سے ایک مفید اصطلاح استعمال کی ہے "مزاحمت کی درسیت۔" دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے مطالعے کا مرکز کراچی کی پرانی بستی لیاری ہے جو ایک برق رفتار میٹروپولس میں اپنی واضح شناخت قائم رکھے ہوئے ہے۔ سلم باخ کے مطالعے میں "متبادل تعلیمی جذباتی مرحلے" (alternative educational processes)۔ جس کے ساتھ ادب کے حوالے سے 'جذباتی رویے' emotional responses بھی میں اس تعریف میں شامل کرنا چاہوں گا ان ثقافتی اقدار، وفاداریوں اور خوابوں کے فروغ کا وسیلہ ہیں جو غالب ثقافت سے بنیادی طور پر (radically) مختلف ہے۔ بلوچستان کے افسانوں میں اسی طرح

"ریاست اور معاشرے کے درمیان ساختیاتی اور تہذیبی دونوں طرح
کا ایک نہایت بنیادی تضاد پیدا ہوتا جا رہا ہے۔"

انہوں نے تو خیر اس کے پیچھے کارفرما بنیادی عوامل کا ایک میزانیہ رقم کر رکھا ہے، لیکن مجھے اتنا عرض کرنا ہے کہ افسانے میں بال پڑنے اور شکستگی کی نشان دہی پاکستان کے ادب نے بھی کسی حد تک کر رکھی ہے وہی ادب جو خود زمین کی طرح ریاست اور مملکت سے مختلف ہے اور ممتاز ہے، جو ریاست خود دوسرے گروہوں پر نہیں۔ تضاد یا شکست اور بد دلی کا یہ رنگ بلوچستان کے افسانے میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس کا اختصاص بھی ہے اور تخلیق کی راہ میں رکاوٹ بھی۔

اس تضاد کے ڈانڈے ظاہر ہے کہ سیاسی بد دلی سے جا ملتے ہیں۔ بد دلی کا یہ انداز بھی بلوچستان سے مخصوص ہے۔ مثال کے طور پر خادم بزنجو کے مجموعہ مضامین "بلوچستان کیا ہوا، کیا ہوگا" میں شامل ایک طویل مکتوب کی آخری سطریں:

"وائے بد نصیبی! سب کے کام بنیں گے، پاکستانی حکمرانوں کے، ان کے بلوچ دوستوں کے، بیرونِ ملک بیٹھے سیاست دانوں کے، طلبہ کے لیڈر اور سرکردہ رہنماؤں کے، ماضی کے گواہوں کے۔ ہر کسی کو اپنے کیے کا معاوضہ ملے گا۔ نقصان رہے گی بلوچ قوم۔ بلوچ کے لیے وہی خواری، وہی تنگ دامنی۔ اس کے سر پر جھوٹ کی بارش، منافقت کا سیلاب، غیبت کے کالے بادل، دوغلے پن کا سیاہ چادر اور سازش کی اندھیری رات۔ یہ تاریکیاں کچھ عرصے تک یقیناً بلوچستان پر سایہ فگن رہیں گی۔"

("بلوچستان، کیا ہوا، کیا ہوگا؟" کراچی، ۱۹۸۹ء)

سیاست دوراں افسانے کی تعمیر میں داخل ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ سیاسی ناراضگی اپنی جگہ مگر وہ ادبی مطالعے کو بعض مرتبہ محدود معانی کا پابند بھی بنا سکتی ہے۔ امریکی ناقد فریڈرک جیمسن نے لکھا تھا کہ تیسری دنیا کا تمام ادب لازماً اجتماعیت اور قومی تعمیر کی تمثیل ہے اور اسی

سے پہلی دنیا کے قارئین کے لیے خاصی دلچسپ۔ جیمسن بھی محکوم قوموں کے ادب کو اسی ایک رخی انداز و اسلوب کے ساتھ دیکھ رہا ہے، جس طرح ہمارے سیاسی مفسرین کرتے آئے ہیں۔ مجھے اس کے بجائے اعجاز احمد کا نقطۂ نظر زیادہ بامعنی معلوم ہوتا ہے، جنھوں نے کہا ہے کہ جس طرح ''امریکی مابعد جدید ثقافت'' کا متعین ورثے شدہ جواب قوم پرستی کا نہیں ہے، اسی طرح تیسری دنیا میں لکھے جانے والے ہر متن کو ''قومی تمثیل'' نہیں کہا جا سکتا۔ جیمسن کا یہ اندازِ فکر وحدانی ہوتا ہے اور متن کو ایک پیراڈائم بنا کر رکھ دیتا ہے جو داخلی طور پر صرف ایک طرف کو جاتا ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں تخلیق کیے جانے والے ادب کی طرح بلوچستان کا افسانہ بھی شادابی کا غائب ہے، متن کی بھی اور ذہن کی بھی۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس مضمون میں ''مزاحمت'' کا لفظ استعمال تو ہوا ہے مگر اسے ''مزاحمتی ادب'' سے منسلک نہ کیا جائے جو ان دنوں مفادات حاصل کرنے کا ایک آسان بہانہ بن کر رہ گیا ہے۔۔۔ یعنی مزاحمت وہی اچھی جس کا نتیجہ بھی اچھا ہو! ان افسانوں میں درسیات اگر ہیں تو صرف مزاحمت کی نہیں، بلکہ سمجھنے کے وسیلے کے طور پر مفاہمت کا درس بھی ہے۔ وہ مفاہمت جو افہام و تفہیم کے عمل سے وابستہ ہے۔ افسانہ اپنے طور پر سوال اچھال دیتا ہے۔ مگر یہ آپ پر منحصر ہے کہ سننے کا کون سا رخ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اقبال احمد نے دو ٹوک الفاظ میں خبردار کیا تھا کہ ''سندھ اور بلوچستان کے صوبوں میں شکایات کے ابھرنے کا زیادہ امکان ہے۔'' اس تجزیے کی بنیاد کسی مخصوص خفگی کے بجائے ''معیشت کے بحران اور بین الاقوامی تعلقات کے بحران'' سے بھی متعلق ہے۔ آبادی کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ بعض علاقوں کی آبادی اپنی ہی زمین پر اقلیت بن گئی، اگرچہ یہ بات انھوں نے بلوچستان کے حوالے سے نہیں کہی۔ اس سے بھی زیادہ واشگاف انداز میں اور کسی تجزیے کے بغیر محض جذباتی نعرے کے طور پر ہمارے بعض سیاسی رہنماؤں نے بھی ''ریڈ انڈین بن کر رہ جانے'' (بلکہ بنا دیے جانے) پر بلند آہنگ میں

"ہاں بات یہی ہے۔ ہم جگہ جگہ اور گھر گھر گھوم رہے ہیں اور چندہ کر رہے ہیں۔ حکومت کا حکم ہے۔"

"جناب میں ایک گستاخی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس علاقے کے دائمی طور پر قہر و مصائب زدہ لوگوں کے حالات ان علاقوں کے لوگوں کے حالات سے بہتر ہیں؟"

"ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں صرف حکومت کے احکامات پر عمل کرنا ہے۔" تحصیلدار درشتی سے کہنے لگا۔ "کیا آپ حکومت کے احکامات کو نہیں مانتے؟"

("دس دس کے چار نوٹ" از غنی پرواز)

O

انور کون تھا، مستقبل کا وزیر آنے والے دنوں کا ہیرو یا مستقبل کے حوالے سے سیاسی رہنمائی کرنے والا عظیم انسان؟ انور ایک آدمی تھا، عام انسان۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نے کچھ خواب دیکھے تھے، اس کی کچھ خواہشیں تھیں۔ وہ شہرت کی طلب رکھتا تھا۔ اسے نان جویں کے ساتھ طاقت کی بھی طلب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خوابوں کی تعبیر اور اس کی خواہش کی تکمیل کا نقطہ آغاز سول سیکرٹریٹ ہی ہے۔ اس وجہ سے وہ روزانہ سیکرٹریٹ آتا اور مختلف زاویوں سے شہرت، روزی اور طاقت کو اپنانے اور مقامات کے تعین کے بارے میں سوچتا۔

(اور پھر گیٹ کھلا، از منیر بادینی)

O

شاہو پر اب کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اب اسے اپنے محور پر اپنی منزل کا تعین کرنے میں آسانی تھی۔

اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ اس کی بدمعاشیوں کو اس کی

دلیری اور اعتماد کا نام دینے لگے تھے۔ اب وہ باقاعدہ ایک سیاسی پارٹی کا ممبر بن چکا تھا۔ وہ پارٹی میں اپنی کارکردگی کے حوالے سے اہمیت کا حامل بنتا جا رہا تھا۔ کہیں بھی کوئی جھگڑا یا فساد ہوتا تو شاہو وہیں موجود ہوتا۔ کبھی ناظم کے دروازے کو لات مار کر نکل جاتا تو کبھی تحصیلدار کا گریبان پکڑ لیتا۔

(تاریک راہیں، از علی دوست بلوچ)

''قتلِ رحم دلی'' میں دو مختلف حوالہ جاتی فریم۔۔۔ زمین کی حقیقت اور سیاسی، سماجی خطابیوں کا سجا سجایا جھوٹ۔۔۔ ایک دوسرے سے مل کر ایک مختلف قسم کا بیانیہ تخلیق کرتے ہیں۔ ''۲۰۳۵ء'' میں ایک چھوٹا سا حوالہ یہ سراغ دیتا ہے کہ ہم زمانہ حال کی نہیں، اس مستقبل کی بات کر رہے ہیں جس میں کچھ بھی نہیں بدلا۔ یوں اس افسانے کے ابتدائی حصّے کا فونوگرافک انداز گہری معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔۔۔ وہ حقیقت جو بدل کر بھی نہیں بدلتی اور جس کا اظہار ان افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

جو کہانیاں یہ افسانے سنا رہے ہیں، ان کے درمیان ان کہی پھر بھی رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود جو کہانی یہاں ٹکڑے ٹکڑے سننے کو ملتی ہے، اس میں یہاں کے کئی رنگ ہیں اور بعض اپنی جگہ پر اثر۔ بلوچستان کی کہانی کو یوں بھی سنا اور پڑھا جا سکتا ہے، اس کا اندازہ مجھے پہل پہل دو کہانیوں سے ہوا۔ کشور ناہید کے زیرِ ادارت ''ماہِ نو'' کے کسی شمارے میں ''نیلا گلاب'' نام کی ایک چھوٹی سی کہانی شائع ہوئی۔ لکھنے والی کا نام یاسمین مری۔ نام غیر معروف اور کہانی کا اندازِ بیاں سادگی کا حامل۔ الگ الگ سماجی طبقوں سے تعلق رکھنے والی مالکن اور نوکرانی گویا دو الگ کہانیوں کے بیانیے ہیں، ایک محرومی کا اور دوسرا خواہش کی تکمیل کا۔ یہ دونوں بیانیے جہاں intersect کرتے ہیں پسند کی شادی، عورت کی زباں بندی، مصلحت کی بناء پر قائم گھر، چاہت سے محرومی وہاں نیلے گلاب کی ایک بھرپور علامت سامنے آتی ہے۔ بیانیے میں جو

فریم ہوگئی ہے، اصل کہانی شاید اس کے باہر بھی ہے۔ اور پھر ایک بے نام سی کسک کہانی کہ ابھی ادھوری رہ گئی اور ان کہی۔ مصنفہ نے غالباً یہ کہانی اردو میں ہی لکھی تھی۔ انہوں نے ایک آدھ کہانی اور بھی لکھی مگر ان کے بارے میں کوشش کے باوجود پتہ نہ چل سکا۔ کوشش بھی یوں کہ پاکستان کہانیوں کے ایک انتخاب میں، میں نے یہ کہانی شامل کردی تھی۔ وہاں سے پڑھ کر کسی نے کینیڈا سے شائع ہونے والے ایک انتخاب میں شمولیت کی اجازت مانگی۔ میں حیران ہوا کہ یہ کہانی اتنی دور تک بھی جا سکتی ہے۔

بلوچستان کی دوسری کہانی جس نے تعارف ہوتے ہی اپنا اثر قائم کیا، وہ گوہر ملک کی خواب ناک کہانی تھی، ''اور بلوچ نے مجھے دھکا دے دیا۔'' ضمیر نیازی مرحوم کی زیرِ ہدایت، جوہری تباہ کاری کے خلاف ادب پاروں کی تلاش کے دوران یہ کہانی ملی اور ''زمین کا نوحہ'' میں شامل کی گئی۔ ایک سادہ سے خواب میں کتنی گہری محرومیاں نمایاں ہیں زمیں کی محرومیاں جن کا یہاں بلوچستان کے افسانے کا نقش قائم کرتا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کہانیوں کو غالب بیانیے (dominant discoure) یا ادبی canon کے لحاظ سے ہی نہیں، ان کی اپنی کیفیات کے لحاظ سے دیکھنا چاہیے کہ اسی سے ان کا وجود مشروط ہے۔

افضل مراد نے بلوچستان کے افسانے چن کر ایک کتاب بنا دی ہے۔ اس کی خصوصیات اور حدود کا اندازہ بھی رہے تو ان افسانوں کے مطالعے کے لیے سودمند ہوگا۔ افسانوں کو آج کل کے چلتے ہوئے فیشن کے مطابق ''شاہکار'' قرار نہیں دیا۔ ورنہ درآمد کی ہوئی ہر اور بر کھابڑ تحریر کو شاہکار قرار دینا اتنا رواج ہوگیا ہے کہ جیسے ''شاہکار سازی'' ہمارا قومی مشغلہ ہو۔ (جس طرح منٹو نے ''شہید ساز'' کی نشان دہی کی تھی) قریب کی سمی، بے تو دوسری زبان، کہیں کہیں سے جوڑ توڑ کر چند افسانوں کی بطور شاہکار packaging کا کام ایک صاحب نے حال ہی میں اس دھڑلے سے انجام دیا ہے کہ اردو پڑھنے والے یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر اس زبان کے شاہکار افسانے یہ ہیں تو ان کے پڑھنے سے ہم محروم ہی اچھے۔ اب کون پوچھے کہ محرومی

کو افضل ثابت کردینے والی کتابوں سے کیا فائدہ؟

افضل مراد نے نہ تو تاویلات پیش کی ہیں اور نہ فنی کم زوریوں کا سیاسی وسماجی جواز بہانہ بنایا ہے۔ انہوں نے ان کہانیوں کو نمائندہ بھی قرار نہیں دیا۔ یہ کہانیاں بلوچستان کی الگ الگ زبانوں سے لی گئی ہیں اور ان زبانوں کی اپنی ترقی وتبدیلی کی الگ الگ رفتار ہے جس میں افسانہ بھی ایک صنف کے طور پر شامل ہے۔ طاہر محمد خاں نے اپنی کتاب ''بلوچی زبان وادب'' (کوئٹہ ۲۰۰۴ء) میں شامل مضمون ''بلوچی کے افسانے'' میں جہاں ابتدائی دور کے وسائل اور قلم کاروں کا جائزہ لیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ: ''ضرورت اس بات کی ہے کہ ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک کے افسانوں کا کوئی تنقیدی جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ بلوچی افسانہ فنی اعتبار سے کس مقام پر کھڑا ہے۔''

اس بات کی ضرورت اپنی جگہ رہے گی کہ شیر محمد مری کے چند افسانوں سے لے کر گوہر ملک تک، ایک زیادہ جامع انتخاب سامنے آئے۔ اسی طرح پشتو افسانے میں بھی بلوچستان کے افسانوں کا رنگ، پختون خواہ علاقوں کی ادبی کاوشوں سے الگ جھلکتا ہے۔ در محمد کاسی سے لے کر فاروق سرور اور خلیس بادر تک آتے آتے اس میں کئی انداز سامنے آئے ہیں۔ براہوی افسانے کی شناخت تاج رئیسانی سے ایک نیا معیار حاصل کرتی ہے۔ تاج رئیسانی نے اپنے مخصوص انداز میں اردو میں بھی افسانے لکھے ہیں (ان کا افسانہ ''دانہ گندم'' مجھے آج بھی یاد ہے) ایسے ہی قلم کاروں کی بدولت بلوچستان کے افسانوں میں اردو کے افسانے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور پھر آغا گل موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز ہیں۔ لیکن اردو میں لکھے جانے والے افسانے اس مجموعے کے scope کا حصہ یوں بھی نہیں تھے کہ افضل مراد نے کام یہی کیا کہ بلوچستان کے افسانے کو اردو کے قارئین کے امکان مطالعہ کا حصہ اس طرح بنادیا ہے کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے یہ کوئی اور کہانی نہیں ہے۔ ہم اس کہانی کا حصہ ہیں اور یہ ہماری کہانی کا۔

نئی آوازیں

اور میں سوچتا رہ گیا
(غزلیں)
اجمل سراج

تکرارِ ساعت
(غزلیں)
عرفان ستار

یہاں کچھ پھول رکھے ہیں
(شاعری)
شاہدہ حسن

یادیں بھی اب خواب ہوئیں
(شاعری)
فاطمہ حسن

درِ خواب
(غزلیں)
انعام ندیم

اور کہاں تک جانا ہے
(شاعری)
اکبر معصوم

دیس بدیس کے ناول، افسانے

چھاکو کی واپسی
بدیع الزماں

کالا جل
شانی

پیلی چھتری والی لڑکی
اُدے پرکاش

وہ دن
نرمل ورما

رات کا رپورٹر
نرمل ورما

ایک چیتھڑا سکھ
نرمل ورما

اُس کا بنٹی
منو بھنڈاری

ایک ہزار چوراسی کی ماں
مہاشویتا دیوی

مائی
گیتانجلی شری

دھوپ میں لوگ
غسان کنفانی

بڑا آئینہ
محمد مرابط

سترہ کہانیاں
امرتا پریتم

نظم و نثر کے نئے انداز

دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی اشاعتیں

عاشق من الفلسطین

سیاسی سماجی تجزیہ اور نظم و نثر کا انتخاب

دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

میں بغداد ہوں

موجودہ صورت حال کا ادبی تناظر

ناول ناول پاکستان

پاکستانی معاشرے کے حالات و واقعات کی عکاسی

پاکستانی زبانوں کا ادب

کہانیاں جو اب تک ان کہی تھیں

دیا اور دریا
افضل احسن رندھاوا

عشق کے مارے ہوئے
زاہد حسن

ہمہ اوست
آغا سلیم

جلاوطن
نورالہدیٰ شاہ

اندھیری دھرتی روشن ہاتھ
آغا سلیم

دوآبہ
افضل احسن رندھاوا

تتلیاں اور ٹینک
احمد سلیم

کہساروں کے یہ لوگ
طاہر آفریدی

بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا حلقہ بڑا وسیع اور معتبر ہے، خصوصاً افسانہ نگاری میں قدیم کلاسیکی میلانات اور جدید فکری طرزِ احساس، ندرت اور توانائی سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

بلوچی، پشتو اور براہوی افسانوں کا لہجہ منفرد بھی ہے اور قابلِ احترام بھی۔ افضل مراد نے بلوچستان میں تخلیق ہونے والے افسانوں کو اُردو کے قالب میں ڈھال کر اُردو ادب کو نئی قدرت اور نئی فکر سے آشنا کیا ہے۔ پاکستانی افسانوں کے باہمی انجذاب میں افضل مراد کی یہ کوشش یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ ''انجیر کے پھول'' اُردو ادب کے لیے ایک تحفہ ہے۔

ڈاکٹر فاروق احمد

صدر شعبہ اُردو، جامعہ بلوچستان

''انجیر کے پھول'' تراجم پر مشتمل ہے۔ مگر ان میں اپنا ایک تخلیقی حُسن ہے۔ ترجمہ بظاہر ایک مشکل صنفِ ادب ہے۔ تخلیق کار کے حُسنِ خیال کو سمجھنا اور ایک مختلف زبان میں اسے دوبارہ پیش کرنا نگینہ سازی اور قالین بافی کی مانند ایک کارِ محال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گہرے پانیوں میں اُتر اُتر کر افضل مراد موتی ڈھونڈ لایا ہے، جنہیں اس نے ایک لڑی میں پرو کر ''انجیر کے پھول'' کی شکل میں پیش کیا ہے۔

آغا گل

ISBN: 969-8636-61-7

Price: Rs. 160/=